محیؔ الدین نواب

محیؔ الدین نواب اِس ماہ "لہو کے پھول" لے کر حاضر ہوئے ہیں۔

لہو کے پھول' اسرار و تجسس کے سانچے میں ایک سماجی کہانی ہے۔ اس قسم کی کہانیاں ہمارے معاشرے میں بہت پائی جاتی ہیں ـــــ اس کہانی کا کمال یہ ہے کہ قاری کو اپنی نشست سے اُٹھنے نہیں دیتی ـــــ وہ اسرار کے تانوں بانوں میں اتنا اُلجھ جاتا ہے کہ اُسے دُنیا و ما فیہا کی خبر نہیں رہتی اور یہ ایک شاہکار کہانی کی خصوصیت ہے۔ اگلے ماہ انہی صفحات پر آپ محیؔ الدین نواب کی ایک بے حد عجیب سماجی کہانی پڑھیں گے ــــــــــــــــــــ

(اقبال پاریکھ)

گدھا

گاڑی بہت ہی پُرانی اور بوڑھی تھی اس میں بیٹھی ہوئی لڑکی نہایت ہی حسین اور جوان تھی۔ گاڑی کچے راستے کے نشیب و فراز میں ہچکولے کھاتی ہوئی تیزی سے آگے بڑھتی جارہی تھی۔ گاڑی بان کے پیچھے بیٹھی ہوئی لڑکی ہر ہچکولے پر ڈگمگا رہی تھی اور چاروں طرف ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسے پہلی بار اس علاقے سے گذر رہی ہو۔

دُور دُور تک سندھ کی بنجر زمینیں پھیلی ہوئی تھیں کہیں کہیں کھیت نظر آرہے تھے اور جہاں کھیت نظر آجاتے تھے وہاں لڑکی کی آنکھوں میں پیار بھری خوشیوں کی چمک پیدا ہوجاتی تھی۔ یوں لگتا تھا وہ ان کھیتوں کی جوان فصلوں میں اپنے گبرو جوان کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھ رہی ہو۔

اس کی سیاہ غزالی آنکھیں، ریشم جیسے سنہرے بال، اس کے چہرے کی دُودھیا گلابی رنگت اور اس کا پہناوا دیکھ کر یہ پتہ چلتا تھا کہ وہ پنجاب کے کسی علاقے سے آئی ہے اور سندھ کی تپتی ہوئی دھوپ میں پسینہ پسینہ ہوتی جارہی ہے۔ دھوپ کی تپش میں اس کا چہرہ انگارے کی طرح سُرخ ہو رہا تھا۔ راستے کی اُڑتی ہوئی گرد اس کے حسن کو دھندلانے کی ناکام کوششیں کررہی تھی۔ گاڑی جھٹکے کھاتی ہوئی، کبھی اُوپر سے نیچے اور نیچے سے اُوپر اچھلتی ہوئی دھمکیاں دے رہی تھی کہ اسے اٹھا کر راستے کے کنارے پھینک دے گی لیکن وہ بڑے ہی مستحکم اعتماد سے ایسے بیٹھی ہوئی تھی جیسے ایک عورت اپنی آنکھوں میں انتظار سجا کر اور ایک ماں اپنی گود میں بچے کو سنبھال کر بیٹھتی ہے ـــــ اس کی گود میں ایک ننھا سا بچہ تھا۔

بچہ اس کے ہاتھوں کے پالنے میں تھا اور اس کے سینے سے لگا ہوا تھا! اس کے سر کے بال بھی سنہرے تھے۔ جسم کی رنگت سُرخ و سفید تھی۔ اسے اس دنیا میں آئے ہوئے زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس دن ہوئے تھے۔ لڑکی اسی انتظار میں تھی کہ بچہ گود میں آئے گا تو اس سفر کا آغاز کرے گی! اس کے گھر والوں نے اسے روکا تھا کہ ایسی حالت میں اسے گھر سے نہیں نکلنا چاہیے لیکن وہ سب کے روکنے ٹوکنے کے باوجود بچے کے باپ کی تلاش میں نکل گئی تھی۔

نہ جانے وہ کون بدنصیب تھا جو ایسے بے پناہ حسن و شباب کو بھول کر کہیں بھٹک گیا تھا۔ وہ حسینہ تو ایسی تھی جسے کوئی بھی شخص اپنی نگاہوں کے فریم میں ہر وقت سجائے رکھتا! اس وقت وہ نارنجی رنگ کے سوٹ میں سُرخ گلاب کی طرح کھلی ہوئی تھی! اس کے محبوب کو سُرخ گلاب پسند تھے۔ وہ اکثر سوچتا تھا کہ جب اس کا ایک مکان ہوگا تو اس کے آنگن میں سُرخ گلاب کے پودے لگائے گا لیکن جب وہ دُلہن بن کر آئی تو اس نے گھونگھٹ اٹھا کر کہا۔

"شادو! اس سُرخ جوڑے میں تو گلاب کی کلی نظر آتی ہے۔ کبھی کبھی یہ لباس پہن لیا کرنا، اب میں گلاب کے پودے نہیں لگاؤں گا....."

شادو سہاگ رات کے ان رنگین اور معطر لمحات کو یاد کرکے سندھ کی جلتی ہوئی دھوپ میں بھی مسکرانے لگی۔ عورت کہیں بھی ہو، اگر اس کی آنکھوں میں اپنے گبرو جوان کی تصویر ہو تو وہ انگاروں پر بھی چلتے چلتے مسکراتی ہے۔

دُور ایک بڑا سا مکان نظر آرہا تھا۔ مٹی کی چھت اور مٹی کی دیواریں تھیں۔ ایک درخت کے سائے میں دو بھینسیں بیٹھی ہوئی جگالی

کررہی تھیں۔ شاید اس کی منزل آگئی تھی! اس کا انتظار ختم ہو رہا تھا۔

گدھا گاڑی دروازے کے قریب آکر رُک گئی۔ گاڑی بان نے کھردرے لہجے میں کہا۔ "یہ عثمان گوٹ ہے۔ آگے دو فرلانگ پر ایک چھوٹی سی بستی ہے، اب بتاؤ اسی مکان میں جانا ہے یا آگے بستی میں ؟"

"میرے خیال میں یہی مکان ہے۔" شادو نے کہا۔ "میں اسی مکان کے پتہ پر خط لکھتی رہی ہوں۔ تم ذرا ٹھہرو، میں دروازے پر دستک دیکر پوچھتی ہوں۔"

گاڑی بان نے ہاتھ اٹھا کر بے رُخی سے کہا۔ "بی بی جی! میرا کرایہ دو، میں یہاں سے جاؤں گا۔ تم دس گھروں میں پوچھتی پھروگی تو میں تمہارے پیچھے نہیں پھروں گا۔ وہ تو اسٹیشن ماسٹر کی زبردستی سے میں بیس میل دُور آگیا ہوں۔ اچھا ظلم ہے۔ بابو لوگ رُعب جما کر ہمیں بھی گدھوں کی طرح ہانک دیتے ہیں۔ اونہہ! لاؤ میرا کرایہ۔ پورے چھ روپے لوں گا۔"

وہ چُپ چاپ گاڑی سے اُترنے لگی۔ گاڑی بان نے کپڑوں کی گٹھری اور پلاسٹک کا تھیلا اٹھا کر دروازے پر رکھ دیا، پھر اس سے چھ روپے وصول کرکے گاڑی کو موڑتا اور زیرِ لب بڑبڑاتا ہوا واپس جانے لگا۔

وہ اس انجانی جگہ پر تنہا رہ گئی۔ دروازے پر سامان رکھا تھا، گود میں بچہ سو رہا تھا اور سر پر سورج چمک رہا تھا۔ وہ آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دینے لگی۔

دستک کے جواب میں تھوڑی دیر تک خاموشی رہی، پھر دروازہ ذرا سا کھلا۔ اتنا ذرا سا کہ اندر سے صرف ایک بڑھیا کا چہرہ جھانکتا ہوا نظر آرہا تھا۔ بکھرے ہوئے سفید بالوں کے درمیان سیاہی مائل جھریوں والا چہرہ، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں، ناک طوطے کی طرح نوکیلی، سامنے کے دو دانت قدرے لانبے تھے اور نچلے ہونٹوں پر جھکے ہوئے لگتے تھے۔ وہ ایسا خبیث چہرہ تھا کہ شادو اسے دیکھتے ہی کسی انجانے خطرے کے احساس سے کانپ گئی! اس نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے پوچھا۔

"یہ ــــ فریدے کا مکان ہے ؟"

"فریدے ؟" بڑھیا نے اسے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ "تم کون ہو ؟"

"میرا نام شاداں ہے۔ میں جڑانوالہ سے آئی ہوں ــــ فریدے یعنی کہ فرید احمد میرا خاوند ہے۔"

بڑھیا کی نظریں اور زیادہ چبھنے لگیں۔ مکان کے اندر سے کسی عورت کی آواز سنائی دی۔ "ماں جی! کون ہے ؟"

بڑھیا نے جواب دیا۔ "ایک جوان لڑکی ہے۔ گود میں بچہ ہے۔ کہتی ہے، فریدے اس کا خاوند ہے۔"

اس کی بات پوری ہوتے ہی ایک عورت وہاں پہنچ گئی اور دروازے کو پوری طرح کھول کر اسے دیکھنے لگی۔ آنے والی عورت شادو کی ہم عمر تھی۔ اس کی طرح جوان اور صحت مند تھی لیکن اس کے جیسا اُجلا رنگ نہیں تھا۔ وہ گہرے سانولے رنگ کی دوشیزہ تھی۔ وہ شادو کو ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسے کوئی مصیبت دروازے پر آگئی ہو۔ وہ روکھے پن سے بولی۔ "یہاں کوئی فرید احمد نہیں رہتا ہے۔ آگے بستی میں جاکر پوچھو۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے ؟" شادو نے کہا۔ "میں فرید احمد عثمان گوٹ معرفت محکمہ زراعت سندھ کے پتے پر خط لکھتی رہی ہوں، سات ماہ پہلے فریدے نے میرے ایک خط کا جواب دیا تھا۔ بہن! تم ہی میری یہ اُلجھن دُور کرو کہ یہاں سے کس فریدے نے مجھے خط لکھا تھا ؟"

اس سانولی لڑکی نے کہا۔ "تم خود ہمیں اُلجھا رہی ہو۔ ہم پہلی بار کسی فرید کا نام سُن رہے ہیں۔ تم محکمے والوں کے پاس جاکر پوچھو تو تمہیں حقیقت معلوم ہوجائے گی۔"

"میں کہاں جاؤں ؟ کس سے پوچھوں ؟ اس علاقے میں پہلی بار آئی ہوں۔ سفر کی تھکن سے بُرا حال ہو رہا ہے۔ اب ایک قدم آگے بڑھنے کا بھی حوصلہ نہیں ہے۔ کیا تم مجھے تھوڑی دیر یہاں سستانے کی اجازت نہیں دوگی ؟ تمہاری باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ تم بھی پنجاب کی رہنے والی ہو۔ میں تمہارے علاقے کی ہوں۔ میری پریشانیوں کا کچھ خیال کرو۔"

سانولی لڑکی نے اپنی بوڑھی ماں کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ خبیث بڑھیا نے شادو سے کہا۔ "یہ میری بیٹی کندن بی بی ہے۔ صبح اس کا بچہ مرگیا ہے۔ گھر میں اس کی میت پڑی ہے۔ تمہاری گود کا بچہ زندہ ہے۔ کیا اس بچے کو تم ہمارے گھر میں لے کر آؤ گی ؟"

"ہاں جی!" شادو نے کہا۔ "زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ میرے بچے کو کچھ نہیں ہوگا!"

"ہی ہی ہی!" بڑھیا کے دو لانبے دانت کچھ اور نمایاں ہوگئے۔ وہ ہنستی ہوئی بولی۔ "بیشک! زندگی خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن موت انسان کے ہاتھ میں ہے۔ ایک انسان بڑی آسانی سے دوسرے انسان کو موت کی نیند سُلا دیتا ہے۔"

شادو کو ایسا لگا جیسے وہ بڑھیا دھمکی دے رہی ہے۔ کوئی دوسرا وقت ہوتا تو شادو اس خبیث بڑھیا اور بدمزاج کندن بی بی کی صورت تک دیکھنا گوارا نہ کرتی مگر اس وقت آس پاس کوئی دوسرا مکان نہ تھا۔ قریبی بستی وہاں سے دو فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔ گدھا گاڑی میں بیس میل کا سفر کرنے کے بعد بدن کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ تھکن، فرید کی گمشدگی، مایوسی اور تنہائی نے اسے ایسا نڈھال کردیا تھا کہ وہ وہاں بیٹھ کر ذرا تھکن

اتا لے نے پر مجبور ہو گئی تھی ۔ کُندن نے کہا۔

”یہ علاقہ بہت خطرناک ہے ۔ چور بدمعاش تنہا عورت کو پاکر اس کی بے عزتی کرتے ہیں ۔ پھر اسے قتل کر دیتے ہیں ۔ تعجب ہے تم یہاں تک تنہا کیسے آگئی ہو؟“

”محبت کھینچ لائی ہے“۔ شادو نے مسکرا کر کہا ”جب تک فرید کا پیار زندہ ہے، مجھے کوئی قتل نہیں کر سکے گا ۔ کیا میں اندر آجاؤں؟“

”آجاؤ!“ دونوں ماں بیٹی ایک طرف ہو گئیں۔

شادو ایک ہاتھ سے بچے کو سنبھال کر اور دوسرے ہاتھ سے سامان اٹھا کر ان کے سامنے سے گذری تو کُندن مرجھا گئی ۔ اس کا رنگ سانولا تھا لیکن شادو کے چکنے اور اُجلے بدن کے مقابل وہ سیاہ پڑ گئی تھی اور بڑی حاسدانہ نظروں سے اسے دیکھے جا رہی تھی ۔ بڑھیا نے کہا۔

”تم بہت دُور سے آئی ہو ۔ میں تمھارے لیے نمکین لسّی لیکر آتی ہوں۔“

”نہیں ماں جی! بچّہ میرا دُودھ پیتا ہے، میں لسّی پیوں گی تو اسے زکام ہو جائے گا ۔ آپ مجھے ایک گلاس ٹھنڈا پانی پلا دیجیے۔“

بڑھیا کمرے سے باہر چلی گئی ۔ شادو نے منجھی پر بیٹھ کر بچے پر سے چادر ہٹا دی اور اپنے دوپٹے کے آنچل سے اسے پنکھا جھلنے لگی۔ بچّے نے آنکھیں کھول دی تھیں ۔ اس کی نیلی نیلی آنکھیں کُندن کے دل میں چبھنے لگیں ۔ وہ بڑے غور سے اسے دیکھ رہی تھی ۔ ماں چاند تھی، بیٹا چاند کا ٹکڑا تھا ۔ شادو نے اسے چوم کر کہا۔

”بالکل اپنے باپ جیسا ہے ۔ فرید کی آنکھیں بھی نیلی ہیں۔“

کُندن نے طنزیہ انداز میں پوچھا ”کہاں ہے تمھارا فرید؟“

وہ طنز نہ کرتی، سادگی سے پوچھتی، تب بھی یہ دل دُکھانے والی بات تھی کہ فرید اس کی محبت کا مذاق اُڑانے کے لیے اسے چھوڑ کر چلا گیا ہے ۔ وہ اسے تلاش کرنے جڑانوالہ سے بس میں بیٹھ کر شورکوٹ آئی ۔ وہاں سے ٹرین کے ذریعے شہداد پور پہنچی ۔ شہداد پور سے گدھا گاڑی میں بیٹھ کر اس اُجاڑ علاقے میں جہاں دو بھینسوں اور دو عورتوں کے سوا کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔

وہ کُندن کے سوال کا جواب دینے کی بجائے دوسری طرف منہ پھیر کر بیٹھ گئی ۔ دوسری طرف کے کھلے ہوئے دروازے سے گھر کا آنگن نظر آرہا تھا ۔ آنگن کے وسط میں ایک کنواں تھا اور کنویں کے اس پار .....

اس پار نظر جاتے ہی شادو کا دل بے اختیار دھڑکنے لگا ۔ اس کی آنکھیں ایک نئی اُمید سے روشن ہو گئیں ۔ کنویں کے اُس پار گلاب کے پودے نظر آ رہے تھے۔

گلاب — جو فرید کو پسند تھے اور وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ اس کا اپنا گھر ہو گا تو وہ آنگن میں سُرخ گلاب کے پودے لگائے گا مگر وہاں جو گلاب کھلے ہوئے تھے، وہ سفید تھے اور وہ عورتیں کہہ رہی تھیں کہ یہ فرید احمد کا مکان نہیں ہے ۔ پھر وہ کون شوقین ہے جو اس بنجر زمین پر گلاب کے پھول کھلا رہا ہے؟

اب شادو کو یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ کسی دوسرے کا مکان ہے ۔ دل کہہ رہا تھا کہ وہ اپنے فرید کے مکان میں بیٹھی ہے اور اس کے آنگن میں گلاب کھل رہے ہیں ۔ بلا سے وہ سُرخ نہ ہوں ۔ ہو سکتا ہے کہ وہاں کی مٹی میں سُرخ گلاب نہ کھلتے ہوں ۔ فرید نے سفید پر ہی اکتفا کیا ہو ۔ بہرحال دل میں اُمید کی ایک کرن پھوٹ رہی تھی۔

اس نے کُندن سے پوچھا ”تمھیں گلاب کے پھول پسند ہیں؟“

”میرے آدمی کو پسند ہیں ۔ وہ سُرخ .....“ وہ کہتے کہتے ٹھٹھک گئی اور ہونٹوں کو سختی سے بھینچ کر شادو کے نارنجی رنگ کے لباس کو گھورنے لگی ۔ وہ لباس کی پنکھڑیوں میں سمٹی ہوئی سُرخ گلاب کی ایک کلی نظر آرہی تھی اس لیے کُندن یہ نہ کہہ سکی کہ اس کے مرد کو کس رنگ کا گلاب پسند ہے۔

شادو اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ کہتے کہتے کیوں رُک گئی ہے لیکن اسی وقت بڑھیا ایک گلاس پانی لے کر آگئی ۔ اس نے گلاس ہاتھ میں لیتے ہوئے پوچھا ”تمھارے خاوند کا نام کیا ہے؟“

اس نے پانی پیتے ہوئے گلاس کے اُفق سے دیکھا، دونوں ماں بیٹی ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

”اس کا نام کرم دین ہے“۔ کُندن نے مختصر سا جواب دیا اور جلدی سے اپنی ماں کا بازو پکڑ کر اسے کھینچتی ہوئی کمرے سے باہر آنگن کی طرف لے گئی ۔ آنگن میں پہنچ کر اس نے کن انکھیوں سے شادو کی جانب دیکھا ۔ پھر وہاں سے بھی ماں کو کھینچتی ہوئی دوسری طرف چلی گئی ۔ شادو کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

شادو اسی طرح منجھی پر بیٹھی ہوئی تھی ۔ وہ دونوں ماں بیٹی اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھیں لیکن ان کا سایہ آنگن کے کچے فرش پر نظر آرہا تھا ۔ دو سائے آپس میں سر جوڑ کر کچھ کہہ رہے تھے، کچھ سُن رہے تھے کبھی ان کے سر اثبات میں اور کبھی نفی میں ہلتے تھے ۔ وہ دونوں ہاتھ نچا کر باتیں کرنے کی عادی تھیں اس لیے ان سایوں کے ہاتھ بار بار ناچ رہے تھے ۔ بس یوں لگ رہا تھا جیسے ڈھلتی دوپہر میں دو چڑیلیں آنگن کے کچے فرش پر تھرک رہی ہیں۔

ان کی حرکتوں سے شادو کو یقین ہو رہا تھا کہ وہ ماں بیٹی اس سے کچھ چھپا رہی ہیں ۔ جو کہنا چاہیے وہ نہیں کہتیں ۔ وہ کوئی بہت بڑی حقیقت تھی جسے شادو کسی حد تک سمجھ رہی تھی اور جیسے جیسے وہ سمجھ رہی تھی اس کا

دل رو رہا تھا۔ رونے کی بات ہی تھی۔ سُرخ گلاب فرید کو پسند تھے اور کندن کے خاوند کی پسند بھی وہی تھی۔ کندن نے جس انداز میں سوچ کر اپنے خاوند کا نام بتایا تھا، اس سے ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ اس کا نام کرم دین نہیں ہے، اس کے خاوند کا نام ......

"نہیں۔ نہیں۔" وہ اپنے دل کو سمجھانے لگی۔ "کندن کے خاوند کا نام فرید احمد نہیں ہو سکتا۔ فرید میرا ہے۔ مجھے دل وجان سے چاہنے والا کندن کا خاوند نہیں بن سکتا.....!"

وہ سوچ رہی تھی۔ بچے کے رونے سے چونک گئی۔ اتنے میں دونوں ماں بیٹی کمرے میں واپس آ گئیں۔ کندن نے کہا۔

"میں ماں جی کو سمجھا رہی تھی کہ تم بہت دُور سے آئی ہو۔ اس علاقے میں تنہا اپنے خاوند کو تلاش نہیں کر سکو گی۔ میرا آدمی تمھارے فرید کو کہیں سے ڈھونڈ نکالے گا۔"

"تمھارا آدمی کہاں ہے؟" شادو نے پوچھا۔

"وہ محکمۂ زراعت کے ایک افسر سے ملنے سکھر بیراج گیا ہے۔ وہ رات کو کسی وقت لوٹے گا یا پھر صبح تک ضرور آ جائے گا۔ اس کے آنے تک تم یہاں رُک جاؤ۔ اس کے انتظار میں، میں نے اب تک اپنے بچے کو دفن نہیں کیا ہے۔"

شادو نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ بھول گئی تھی کہ اس گھر میں ایک بچے کی میّت رکھی ہے۔ اچانک شادو کے سوچنے کا انداز بدل گیا۔ اس کے سامنے ایک ماں اپنے بچے سے محروم ہو گئی تھی۔ ایسی حالت میں کندن بیزاری سے اور اکھڑے ہوئے لہجے میں باتیں کر رہی تھی اور شادو اسے بدمزاج سمجھ رہی تھی۔

اگر وہ بدمزاج ہوتی تو اسے اپنے گھر میں رہنے کے لیے نہ کہتی اور اس کے فرید کو تلاش کرنے کے لیے اپنے خاوند کی خدمات پیش نہ کرتی۔ اس نے ہمدردی سے کہا۔

"مجھے تمھارے بچے کی موت کا سخت افسوس ہے۔ کیا وہ بیمار تھا؟"

"نہیں۔ بیمار نہیں تھا، بس سات دنوں کی زندگی لیکر آیا تھا۔ اُسے دیکھو گی؟"

"ہاں دیکھوں گی۔ یہ رو رہا ہے، پہلے اِسے دُودھ پلا کر سُلا دوں، پھر چلوں گی۔"

یہ کہہ کر وہ بچے کو دُودھ پلانے کے لیے قمیض کا دامن اُٹھانے لگی۔ دامن اٹھا تو گورا گورا پیٹ ننگا ہو گیا۔ کندن کی نگاہیں وہاں جم گئیں۔ دامن اور اوپر اٹھا، سینے کا زرخیز ابھار ایکدم سے سامنے آ گیا۔ ایک ماں اپنے بچے کو دُودھ پلا رہی تھی، لہٰذا وہاں خیالات کی پاکیزگی ہونی چاہیے تھی اور ایسے وقت جبکہ اس عُریاں سینے کو دیکھنے والی عورتیں ہی تھیں، کسی عیّاش مرد کی ننگی نگاہیں نہیں تھیں لیکن بعض اوقات ایک حاسد عورت دوسری عورت سے اپنا موازنہ کرنے کے لیے بہت دُور تک دیکھتی ہے اور بہت دُور تک سوچتی ہے۔ کندن اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر ایک مرد کے خیالی ہاتھ کو دیکھ رہی تھی۔ وہ مردانہ ہاتھ شادو کے چکنے بدن پر پھسل رہا تھا۔ اس کی اُجلی رنگت اور حرارت پر مچل رہا تھا۔ اس کے سینے کے نشیب و فراز پر بھٹک رہا تھا۔ کندن دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچے گہری گہری سانسیں لینے لگی۔ عورت کبھی برداشت نہیں کرتی کہ اس کا آدمی کسی دوسرے بدن کے شہر میں بھٹک جائے۔

وہ زیادہ دیر تک اُس حسین نظّارے کو برداشت نہ کر سکی۔ اُدھر سے منہ پھیر کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ بڑھیا پہلے ہی گلاس لے کر باورچی خانے کی طرف چلی گئی تھی۔ جب بچہ سو گیا تو شادو نے اُسے منجی پر ڈال دیا۔ پھر اس کے نچلے نصف جسم کو چادر سے ڈھانپ کر اسے ممتا بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔ اسے دیکھنے کے دوران ایک مُردہ بچے کا خیال آیا تو پھر کندن کے لیے اس کا دل ہمدردی سے بھر گیا۔ وہ اٹھ کر کمرے سے باہر جانے لگی۔

آنگن میں پہنچ کر اس نے گلاب کے پھولوں کو دیکھا تو پھر

فرید کا چہرہ مسکرانے لگا۔ اس کی سوچ رہ رہ کر بدل رہی تھی۔ کبھی وہ سوچتی کہ وہ فرید کے لگائے ہوئے پودے ہیں اور کبھی کندن کی ابھرتی ہوئی ممتا متاثر کرتی کہ ایک غمزدہ عورت جھوٹ نہیں بول سکتی۔ یہ کسی کرم دین کا مکان ہے۔

اُس نے نیچ آنگن میں کنوئیں کے پاس کھڑے ہو کر دیکھا۔

دونوں ماں بیٹی نظر نہیں آ رہی تھیں۔ شاید بڑھیا باورچی خانے میں تھی اور کندن اس سامنے والے کمرے میں، جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ شادو آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دروازے پر آ گئی۔ کمرے کے اندر وہ نہیں تھی۔ اُس کا مردہ بچہ ایک چٹائی پر پڑا ہوا تھا۔

اس نے جھجکتے ہوئے کمرے میں قدم رکھا۔ دو چار قدم آگے بڑھی۔ پھر بچے کا چہرہ واضح طور سے نظر آیا تو وہ ٹھٹھک گئی — وہ مر چکا تھا مگر اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔

اور اس کی آنکھیں نیلی تھیں — جیسے فرید کی آنکھیں نیلی تھیں!

وہ مرجھا گئی۔ پھر اس کا دل لرزنے لگا۔ آہ! کندن کی کوکھ سے جنم لینے والے بچے نے اس کے فرید کی آنکھیں کیسے چرا لیں؟

کیا کرم دین کی آنکھیں بھی نیلی ہیں؟

یہ کیسے ممکن ہے کہ فرید اور کرم دین کی پسند بھی ایک.....

سُرخ گلاب!

دونوں کی آنکھیں بھی ایک جیسی — نیلی!

وہ بچے کو ایک ٹک دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ آج کی رات وہ ضرور اس گھر میں گذارے گی اور اس کرم دین کو دیکھے گی جو رات کو کسی وقت یا صبح تک یہاں پہنچنے والا ہے۔

دروازے پر آہٹ سُنائی دی تو اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہاں کندن کھڑی ہوئی تھی اور اپنے مردہ بچے کو حسرت سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے آہستگی سے کہا۔

"یہ میرا بچہ ہے۔ آج سے چھ دن پہلے جب یہ پیدا ہوا تو قریب کی بستی سے ہماری جان پہچان کی کتنی ہوئی عورتیں آئی تھیں۔ سب یہی کہتی تھیں کہ بچہ باپ پر گیا ہے اور یہ سچ ہے بچہ اپنے باپ کی طرح خوبصورت ہے۔ یہ میری طرح نہیں ہے۔ پھر بھی میں فخر کرتی ہوں کہ اتنے خوبصورت بچے کو میں نے جنم دیا ہے۔ جب اس کا باپ اسے دیکھے گا تو مجھ سے اور زیادہ محبت کرے گا، کیونکہ اسے گلاب کا حسن پسند ہے اور میں نے اس کے لیے ایک گلاب کی تخلیق کی ہے — مگر افسوس! یہ باپ کی گود میں جانے سے پہلے ہی اس دنیا سے چلا گیا...!"

"کیا اس کے باپ نے اسے نہیں دیکھا ہے؟" شادو نے پوچھا۔

"نہیں۔ میں نے کہا نا! کہ وہ محکمۂ زراعت کے کسی افسر سے ملنے گیا ہے۔ مجھ سے کہہ گیا تھا کہ ایک ہفتے کے بعد آئے گا۔ اس کے جانے کے بعد یہ پیدا ہوا اور آج اس کے پہنچنے سے پہلے مر گیا۔ میں ابھی اسے دفن نہیں کرنا چاہتی۔ میں چاہتی ہوں کہ اس کا باپ اسے ایک نظر دیکھ لے اور یقین کر لے کہ میں خوبصورت نہ ہونے کے باوجود اس کے لیے خوبصورت بچے پیدا کر سکتی ہوں۔"

"کون کہتا ہے کہ تم خوبصورت نہیں ہو؟ کیا تمہارا خاوند کہتا ہے؟"

"وہ زبان سے نہیں کہتا مگر میں سمجھتی ہوں، حسین گلابوں کو پسند کرنے والا مجھے اوپری دل سے برداشت کرتا ہے۔ میں سوچتی ہوں اگر دوسرا بچہ باپ کی طرح نہ ہوا، میری طرح ناقابلِ برداشت ہوا تو کیا ہو گا؟ عورت کی ساری عمر یہی سوچتے گذر جاتی ہے کہ وہ مرد کو کس طرح اپنا دیوانہ بنا کر رکھ سکتی ہے — کیا ہی اچھا ہوتا، اگر یہ بچہ زندہ ہو جاتا!"

"تمہیں خدا کی مرضی کے خلاف نہیں سوچنا چاہیے۔ مرنے والے دوبارہ زندہ نہیں ہوتے۔ تم ایسی بات نہ سوچو، جو ناممکن ہو۔"

"بعض عورتیں ناممکن کو ممکن بنا دیتی ہیں۔" کندن نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "ابھی ہم نے کسی کو اطلاع نہیں دی ہے کہ بچہ مر گیا ہے۔ اگر یہاں آس پاس کسی کا مکان ہوتا تو لوگوں کو خود بخود اطلاع پہنچ جاتی۔ میرے آدمی کے کھیتوں میں کام کرنے والے

چار مزدور ہیں، وہ بھی آج نہیں آئے۔ اچھا ہوا نہیں آئے۔ کسی سے یہ کہتے ہوئے دل دُکھے گا کہ اتنی حسین تخلیق ضائع ہو چکی ہے —— آہ! چھ گھنٹے سے یہ خاموش ہے۔ کچھ بولتا نہیں ہے۔ پلکیں بھی نہیں جھپکتا ہے۔ میں بار بار یہاں آتی ہوں اور اسے دیکھتی ہوں کہ شاید یہ روئے گا اور میری ضرورت محسوس کرے گا —— تم کیسے کہتی ہو کہ مرنے والے دوبارہ زندہ نہیں ہوتے ہ؟ اُس عورت کی آنکھوں میں بیٹھ کر دیکھو، جس کا بچہ مر چکا ہے۔ تمھیں وہ مُردہ نظر نہیں آئے گا۔ میں —— میں اس کے باپ کی گود میں اس کا جیتا جاگتا بچہ رکھوں گی۔ اگر میں نے ایسا نہ کیا تو ہمیشہ کے لیے اپنے خاوند کو ہار جاؤں گی۔“

شادو سمجھ گئی کہ بچے کی موت سے اس کے دماغ پر بُرا اثر پڑا ہے، اسی لیے وہ بے تکی باتیں کر رہی ہے۔ وہ تھوڑی دیر تک اسے ہمدردی سے دیکھتی رہی، پھر سر جُھکا کر اپنے بچے کی طرف جانے لگی۔ اپنا بچہ —— جو زندہ تھا —— بچہ زندہ ہو۔ خوبصورت ہو۔ گلاب کی طرح مسکراتا ہو تو خاوند پہلے سے زیادہ بیوی کی قدر کرنے لگتا ہے —— کندن ٹھیک ہی کہتی تھی۔

رات اندھیری نہیں تھی۔ جب آسمان کے مشرقی کنارے سے چاند طلوع ہوا تو ایکدم سُرخ تھا جیسے کسی کے لہو میں ڈوب کر اُبھرا ہو۔ پھر رفتہ رفتہ اس کی رنگت بدلنے لگی جیسے عورت اپنا مزاج بدلتی ہے۔ جیسے خون آشام فطرت کو چھپا کر اُجلی چاندی کی طرح مسکراتی ہے، اسی طرح چاند اپنی اُجلی چاندنی سے مسکراتا ہوا روشن ہو گیا۔

تینوں عورتیں باورچی خانے میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے درمیان گندم کی روٹی، اصلی گھی سے بگھاری ہوئی مونگ کی دال اور لہسن مرچ کی چٹنی رکھی ہوئی تھی۔ کندن اور اس کی ماں برابر لقمے چبائے جا رہی تھیں۔ شادو کے کھانے کی رفتار سُست تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ دو چار لقمے زہر مار کر کے سونے چلی جائے گی۔ تھکن سے بُرا حال تھا۔ بھوک سے زیادہ نیند ستا رہی تھی۔

وہ پانی پینے کے بعد اٹھ گئی اور اس کمرے کی طرف جانے لگی، جہاں اس کا بچہ سو رہا تھا اور جہاں اسے بھی رات گزارنی تھی۔ دونوں عورتوں نے اس کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ دال کی اس پلیٹ کو دیکھ رہی تھیں جو شادو کے سامنے رکھی ہوئی تھی اور اب تقریباً آدھی خالی ہو چکی تھی۔

وہ باورچی خانے سے باہر آئی تو اس کا سر گھومنے لگا۔ شاید تھکن اور نیند کا نشہ غالب آ رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ چاندنی دھوپ کی طرح آنکھوں میں چبھ رہی تھی اور آنگن میں کھِلے ہوئے سفید گلاب کوڑھ کے دھبوں کی طرح لگ رہے تھے۔

وہ چلنے لگی تو پاؤں من من بھر کے ہو گئے۔ وہ لڑکھڑاتی اور سنبھلتی ہوئی دروازے تک پہنچی اور نڈھال سی ہو کر دہلیز پر بیٹھ گئی۔ آگے بڑھنے کی سکت نہیں تھی۔ جی چاہتا تھا کہ وہیں دہلیز پر سو جائے۔ کمرے میں لالٹین کی زرد روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس روشنی میں اس کے جگر کا ٹکڑا منجی پر سو رہا تھا۔ عورت تھک گئی تھی مگر ممتا تازہ دم ہو گئی۔ وہ چوکھٹ کا سہارا لے کر اٹھی اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے بچے کی طرف بڑھنے لگی۔

”کیا ہو گیا ہے مجھے . . . . ؟“ وہ ڈوبتے ہوئے ذہن سے سوچنے لگی مگر اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اچانک ایسی تھکن، یا نیند، یا کمزوری اُس پر کیسے غالب آ گئی ہے؟ وہ چارپائی پر گر پڑی۔ ہوش کی دنیا سے جاتے جاتے اس نے کروٹ بدلی اور اپنے ایک بازو کے سائے میں بچے کو چھپا لیا۔

پھر اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ چہرہ ہر قسم کے جذبے سے عاری ہو گیا اور اس کے رس بھرے ہونٹ ذرا کھُل گئے جیسے ”ربّا“ کہتے کہتے کھُلے رہ گئے ہوں۔

”ربّا! میں بہت دُور سے آئی ہوں۔ انتظار کے کرب سے گزر کر، تلاش کی جلتی ہوئی دھوپ میں بہت دُور سے آئی ہوں اور اپنے فرید کے لیے بہت دُور تک جاؤں گی —— اگر تیرے خزانے میں میری زندگی کی سانسیں ختم ہو گئی ہیں تو ہونے دے۔ مجھے ایسی زندگی دے جو سانسوں کی محتاج نہیں ہوتی —— جیسے سُرخ گلاب —— جو سانس نہیں لیتا —— مگر ہنستا، کھِلتا، مسکراتا اور مہکتا رہتا ہے۔

میں اتنی دُور اپنے لیے نہیں آئی، فرید کے لیے آئی ہوں۔ اسے سُرخ گلاب پسند ہیں۔ تو مجھ سے عورت کی زندگی چھین رہا ہے تو چھین لے مگر ایک گلاب کی زندگی دے دے۔ میں اپنے فرید کو مایوس نہیں کرنا چاہتی، میں ہمیشہ اس کی نظروں کے سامنے رہنا چاہتی ہوں۔ تو بہت بڑا ہے اور میری دعا بہت چھوٹی ہے۔ قبول کر لے!“

جیسے پھُول کھِلتے ہیں، ویسے رس بھرے ہونٹوں کی پنکھڑیاں کھُل گئی تھیں۔

آسمان پر چاند چمک رہا تھا مگر ایسے لگ رہا تھا جیسے طلسمی رات کی ہتھیلی پر مُردہ کھوپڑی مسکرا رہی ہو۔ اس کی روشنی آنگن میں پھیل رہی تھی اور آنگن کے کچے فرش پر دو چڑیلوں کے سائے تھرکتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

وہ آپس میں سر جوڑے سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ منہ سے سانسوں کے بھبکے چھوٹ رہے تھے۔ ایسی آوازیں نکل رہی تھیں جیسے رات کراہ رہی ہو یا چڑیلیں کالا منتر پڑھ رہی ہوں۔ پھر وہ دونوں دبے پاؤں چلتی ہوئی دروازے پر آئیں اور چوکھٹ کے دونوں طرف کھڑی ہو کر کمرے میں جھانکنے لگیں۔

کمرے میں لالٹین کی زرد روشنی اُونگھ رہی تھی اور گلاب کی کلی اپنی خوشبو کو اپنے بازو میں چھپائے سو رہی تھی۔ وہ دونوں دہلیز پر

بیٹھ گئیں — ایک بوڑھا جھرّیوں دار چہرہ تھا جس کے دونوں طرف سفید بال بکھرے ہوئے تھے۔ مُردہ کھوپڑی کی آنکھوں کی طرح اس کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں اور سامنے کے دو دانت نچلے ہونٹوں میں پیوست ہو گئے تھے۔ وہ دانت کچھ اس طرح نمایاں تھے جیسے خبیث بڑھیا ہنس رہی ہو۔

"ہی ہی ہی — بیشک! زندگی خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن موت انسان کے ہاتھ میں ہے۔ ایک انسان بڑی آسانی سے دوسرے انسان کو موت کی نیند سُلا دیتا ہے۔"

بڑھیا نے دونوں ہتھیلیاں اور گھٹنے زمین پر ٹیک دیئے اور چارپائی کے اُس سمت رینگنے لگی، جدھر بچّہ سو رہا تھا۔

دوسری جوان عورت کے بال سیاہ تھے اور چہرے کے اطراف پھیلے ہوئے تھے۔ بال کالے، چہرہ کالا، آنکھیں کالی اور ارادے کالے تھے۔ صرف دانت اُجلے تھے اور ان دانتوں کے درمیان ایک خنجر چمک رہا تھا۔ اس نے بھی دونوں ہتھیلیاں اور گھٹنے زمین پر ٹیک دیے تھے اور چارپائی کے اُس سمت رینگ رہی تھی، جدھر شاد سو رہی تھی۔

ابھی ان کے درمیان دس فٹ کا فاصلہ تھا۔ یہ فاصلہ فوراً ہی طے نہیں ہو سکتا تھا۔ بڑی احتیاط اور ہوشیاری کی ضرورت تھی۔ لالٹین کی روشنی سے چھُپ کر اور دھیمی آہٹوں کا گلا گھونٹ کر بہت آہستہ آہستہ چارپائی تک پہنچنا تھا۔ موت کا یہی دستور ہے۔ وہ ہمیشہ اسی طرح آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی زندگی تک پہنچتی ہے۔

ابھی ذرا دیر تھی۔ اتنی دیر میں دانتوں کے درمیان چمکتے ہوئے خنجر کی تیز دھار نے کہا۔

"میری خوبصورت سوتن! میرے خاوند کا نام کرم دین نہیں، فرید احمد ہے۔

وہی فرید احمد جس کی آنکھیں نیلی ہیں — اور جسے سُرخ گلاب پسند ہیں۔

اور تو اپنے لباس کی پنکھڑیوں میں سمٹی ہوئی گلاب کی کلی بن کر یہاں آئی ہے — کہاں سے یہ حُسن چُرا کر لائی ہے؟ جب تو بچّے کو دودھ پلا رہی تھی تو میں نے تیرے چاندی جیسے بدن کی چکناہٹ دیکھی ہے اور اسے دیکھ کر سمجھ گئی ہوں کہ فرید ہر چار پانچ ماہ کے بعد جڑانوالہ کیوں جاتا ہے؟ وہ تیرے پاس جاتا ہے۔ میں اس کے اتنے قریب رہتی ہوں، پھر بھی تیرا بدن سینکڑوں میل دُور سے اُسے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ حرامزادی! میں تیرے مکھن جیسے جسم کی بوٹی بوٹی کاٹ کر پھینک دوں گی۔ نہ رہے گا بانس، نہ بجے گی بانسری ...."

کمرے کے کچے فرش پر اس کا سایہ گھٹنوں کے بل رینگتا ہوا چارپائی کے قریب پہنچ رہا تھا۔

بوڑھی عورت بھی گھٹنوں کے بل بچّے کے قریب پہنچ رہی تھی۔ اس کے لانبے نوکیلے دانت ہونٹوں سے باہر نکل کر کہہ رہے تھے۔

"ڈائن اپنے داماد اور اس کے بچّے کو کبھی نہیں کھاتی — وہ بچّہ جو سو رہا ہے، وہ میری بیٹی کی سوت کا ہے مگر میری بیٹی کے خاوند کا بھی ہے۔ سوت مر جائے گی تو وہ بچّہ میری بیٹی سے منسوب ہو جائے گا، کیونکہ میرے داماد کا بچّہ کسی کی بھی کوکھ سے جنم لیتا، وہ ایسا ہی خوبصورت ہوتا اور اس کی آنکھیں نیلی ہوتیں۔ عورت اپنے مرد کو صرف زلفوں کی زنجیر سے ہی نہیں، اولاد کی محبّت سے بھی باندھ کر رکھتی ہے اور اس کی نظروں میں اپنی اہمیت بڑھاتی ہے اور اسے یقین دلاتی ہے کہ وہ آئندہ بھی ایسے شاہکار بچّے پیدا کرتی رہے گی

میری بیٹی نے جو بچّہ جنا تھا، وہ صبح مر چکا تھا۔ یہ درست ہے کہ مرنے والے دوبارہ زندہ نہیں ہوتے مگر وہ بچّہ اب زندہ ہو جائے گا۔ سوت کی گود سے نکل کر میری بیٹی کی گود میں آ جائے گا۔ بعض عورتیں ناممکن کو ممکن بنا دیتی ہیں ......"

چار ہتھیلیاں فرش پر سرکتی ہوئیں — چار گھٹنے اپاہجوں کی طرح گھسٹتے ہوئے — کبڑی چڑیلیں جھکی ہوئیں — اور بے رحم موت دانت کچکچاتی ہوئی معصوم زندگیوں کے قریب پہنچ گئیں۔

بڑھیا نے بچّے کو اٹھایا — ممتا کے سائے سے محروم کیا تو وہ اچانک رونے لگا۔

پھر چارپائی میں ہلچل سی مچ گئی۔

"چوں چراں — چوں چراں ...." چارپائی چیخ رہی تھی احتجاج کر رہی تھی۔ بچّہ رو رہا تھا، ممتا کی حرارت کے لیے مچل رہا تھا۔ بڑھیا اسے بازوؤں میں سمیٹے دیوار سے جا لگی تھی اور دیدے پھاڑے دہشت زدہ نظروں سے صید و صیاد کا جنگی تماشہ دیکھ رہی تھی۔ تماشہ سامنے بھی تھا اور اس کے پیچھے دیوار پر بھی تھا۔ سینما کے اسکرین کی طرح، دیوار کی اسکرین پر دو سائے گتھم گتھا نظر آ رہے تھے۔ خنجر کا سایہ بلند ہو رہا تھا اور نیچے دبے ہوئے سائے میں ڈوب رہا تھا۔ آہیں۔ کراہیں۔ بچّے کی چیخیں۔ رات کا سنّاٹا لرز رہا تھا۔ چارپائی تھرّا رہی تھی۔ زندگی پھڑپھڑا رہی تھی۔ پھر ایک آواز — ایک آخری چیخ "دور رہا۔ آ۔ آ۔ آ۔ آ ....."

اس کے بعد سنّاٹا چھا گیا۔ بڑھیا ننھی سی جان کو لیکر کمرے سے باہر چلی گئی

صبح کاذب کی دُھندلی روشنی آنگن میں اُتر رہی تھی۔ ڈربے کے اندر مرغ بانگ دے رہا تھا۔ آنگن پر سایہ کرنے والے درخت پر پرندے

شور مچا رہے تھے اور اپنے گھونسلوں سے جھانک کر دونوں ماں بیٹی کو دیکھ رہے تھے۔ وہ دونوں کنویں کے اُس پار اکڑوں بیٹھی ہوئی زمین ہموار کر رہی تھیں اور گلاب کے اکھڑے ہوئے پودوں کو از سرِ نو ان کی جگہ استادہ رکھنے کی کوششیں کر رہی تھیں۔

جب تمام پودے اپنی اپنی جگہ استحکام سے کھڑے ہو گئے تو بڑھیا ان کی جڑوں میں پانی ڈالنے لگی۔ کندن نے منہ ہاتھ دھو کر بچّے کو گود میں لے لیا اور کنویں کے چبوترے پر اطمینان سے بیٹھ کر گلاب کے پھولوں کو دیکھنے لگی۔ بڑھیا نے اپنی بیٹی کی جانب دیکھا۔ پھر ایک پودے کے پاس زمین پر پاؤں مار کر بولی۔

"جس کا بچّہ زندہ تھا، وہ مُردہ بچّے کے ساتھ یہاں سو رہی ہے۔"

کندن نے اپنی گود کے بچّے کو چوم کر کہا۔ "گلاب گونگے ہیں، وہ کسی کو نہیں بتا سکیں گے کہ کس کی چھاتی پر کھِل رہے ہیں مگر ماں جی! یہ تمام پودے جڑ سے اکھاڑ دیے گئے تھے، اب انھیں دوبارہ لگانے کے بعد کیا ان میں پھول کھِلیں گے؟"

"پتہ نہیں۔ میں نے کبھی باغبانی نہیں کی۔ میں پھولوں اور پودوں کے متعلق کچھ نہیں جانتی۔ میں روزانہ ان کو پانی دوں گی۔ کچھ روز بعد ہی پتہ چلے گا کہ پھول کھِلیں گے یا پودے مر جائیں گے۔"

"پودوں کو زندہ رہنا چاہیے ماں جی! فرید گلابوں کا شوقین ہے۔ اگر یہ مُرجھا گئے تو وہ ناراض ہوگا کہ میں نے اچھی طرح ان کی نگہداشت نہیں کی تھی۔"

بڑھیا ہنسنے لگی "ہی ہی ہی تو پگلی ہے۔ اری! تیری گود میں ایسا گلاب کھِل رہا ہے جسے دیکھ کر فرید دوسرے تمام گلابوں کو بھول جائے گا۔ جا اب آرام سے جا کے سو جا۔ میں بھی ذرا اپنی کمر سیدھی کر دوں گی۔"

کندن بچّے کو لیکر کمرے میں آگئی۔ اسی کمرے میں جہاں پچھلی رات بچّہ اپنی ماں کے ساتھ سویا تھا۔ اب وہ چارپائی اور بستر دُھل گئے تھے اور باہر آنگن میں ڈال دیے گئے تھے تاکہ دھوپ نکلنے پر سوکھ جائیں۔ کمرے میں دوسری کھٹیا اور بستر آگیا تھا۔ فرش کو مٹی سے لیپ کر تمام سُرخ دھبّے مٹا دیے گئے تھے۔ اب وہاں کسی اجنبی عورت کی آمد و رخصت کا کوئی نشان باقی نہ تھا۔ نشانی کے طور پر ایک بچّہ تھا، جو بول نہیں سکتا تھا۔

بچّہ پھر بچّہ ہی ہوتا ہے۔ اسے دوسری چھاتیوں سے دُودھ مل رہا تھا۔ بڑے بڑوں کو اصلی دُودھ نہیں ملتا، اس لیے وہ بے چارہ بھی نقلی دُودھ سے بہل رہا تھا۔

صبح فصل کی کٹائی کرنے والے مزدور آئے۔ گھر سے درانتیاں لے جاتے وقت انھوں نے بچّے کو دیکھا، مسکرائے اور خاموشی سے چلے گئے۔ بھینسوں کا دُودھ دوہنے والا گوالا بھی آیا۔ وہ باہر دروازے سے ہی برتن مانگتا تھا اور دُودھ دوہنے کے بعد بھرے ہوئے برتن دروازے پر رکھ کر چلا جاتا تھا۔ اس روز کندن نے دانستہ اسے گھر میں بلایا کہ وہ اندر آکر برتن رکھ جائے۔ گوالے نے پیدائش کے روز اس کے بچّے کو ایک بار دیکھا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ آج اس دوسرے بچّے کو دیکھ کر اپنی کوئی رائے پیش کرے لیکن اس نے بھی کچھ نہیں کہا، اپنے مالک کے بچّے کو دیکھ کر محبّت سے مسکرایا اور چلا گیا۔

شام کو قریبی بستی سے دو عورتیں ملنے آئیں۔ یہ وہی عورتیں تھیں جو کندن کی زچگی کے وقت آئی تھیں۔ بڑھیا نے انھیں بڑی عزّت سے بٹھایا۔ کندن نے بچّے کو ایک عورت کی گود میں دے دیا۔ عورت نے اُسے بڑے پیار سے چوم کر کہا۔

"آہا۔ کتنا پیارا بچّہ ہے۔ جب پیدا ہوا تو ایسا نہیں تھا، کچھ دُبلا سا تھا۔ ماشاءاللہ! سات دنوں میں کیسے ہاتھ پاؤں نکالے ہیں۔"

بڑھیا نے کہا "ماں کا دُودھ اچھا ہو اور پوری طرح بچّے کی نگہداشت ہوتی رہے تو بچّہ کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ دیکھو نا، بدن میں ذرا گوشت بھرا ہے، گال پھولے ہیں تو ناک پکوڑا ہو گئی ہے۔"

پکوڑا کہنے پر عورتیں ہنسنے لگیں۔ ایک نے کہا۔

"ہاں۔ موٹاپے کی وجہ سے بڑا فرق ہو گیا ہے۔ یعنی پہلے سے زیادہ خوبصورت ہو گیا ہے۔ کندن! اسے اور زیادہ خوبصورت نہ بنانا ایسا نہ ہو کہ آئندہ ہم یہاں آئیں تو پہچان ہی نہ سکیں۔"

کندن ہنستی ہوئی بولی "خوب سے خوب تر بنانا میرے اختیار میں نہیں ہے۔ یہ تو قدرت کے کھیل ہیں اور جہاں تک پہچاننے کا تعلق ہے، میں تو یہ کہوں گی کہ انسان بوڑھا ہو یا بچّہ، وہ اپنی آنکھوں سے پہچانا جاتا ہے۔ جب یہ پیدا ہوا تو تم نے کہا تھا کہ اس کی آنکھیں نیلی ہیں۔ دیکھو آج بھی وہی نیلی آنکھیں ہیں۔"

"سچ کہتی ہو۔ کبھی موٹاپے سے اور کبھی بیماری سے انسان میں بڑی تبدیلیاں آجاتی ہیں لیکن آنکھوں کی رنگت کبھی نہیں بدلتی۔ خدا اسے نظرِ بد سے بچائے رکھے۔ یہ بالکل اپنے باپ پر گیا ہے۔"

کندن دل ہی دل میں بہت خوش ہو رہی تھی کہ بچّہ اسی سے منسوب ہو رہا ہے۔ بڑھیا بھی خوش ہو کر ان عورتوں کی تواضع کے لیے دُودھ لانے باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ ایک عورت نے کہا۔

"ہاں! اس کے باپ کے ذکر پر یاد آیا۔ اب اس کی سزا کتنی رہ گئی ہے؟"

"تین ماہ قید کی سزا سنائی گئی تھی، ایک مہینہ گزر گیا ہے، دو ماہ کے بعد وہ شیر کی طرح دھاڑتا ہوا آجائے گا۔ میرے مرد کے نام سے آس پاس کے تمام زمیندار تھرّاتے ہیں۔"

"یہ تو سچ ہے مگر اب اسے سمجھاؤ کہ اور خون خرابہ نہ کرے، اب وہ صاحبِ اولاد ہو گیا ہے۔ بیوی بچّے کو چھوڑ کر جیل میں زندگی گذارنا اچھی بات نہیں ہے۔"

کندن نے کہا "میں کیا سمجھاؤں بہن! وہ بڑا ضدّی ہے۔ کسی بات پر اَڑ جائے تو پھر کوئی اسے سمجھا نہیں سکتا اور سچ پوچھو تو غلطی اس کی نہیں ہے۔ رحیم گوٹ کا زمیندار ہمارا پانی کاٹ کر اپنے کھیتوں میں لے گیا تھا۔ بس اسی پر فرید کو طیش آگیا! اس نے زمیندار کے آدمی کو مار مار کر ہسپتال پہنچا دیا اور خود تین ماہ کے لیے جیل چلا گیا۔"

اتنے میں بڑھیا دو گلاسوں میں دُودھ لے آئی۔ ان کے ہاتھوں میں دُودھ کا گلاس آیا تو پھر دُودھ پر ہی باتیں شروع ہو گئیں۔ عورتوں کے پاس باتیں کرنے کے لیے موضوعات کی کمی نہیں ہوتی۔ پیٹ بھر کر باتیں کرنے کے بعد وہ اندھیرا ہونے سے پہلے ہی بستی کی طرف واپس چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد بڑھیا نے اطمینان کی سانس لیکر کہا۔

"اب کسی بات کا اندیشہ نہیں ہے۔ جن عورتوں نے پہلے دن بچّے کو گود میں لیا تھا۔ وہ آج اسے دیکھ کر پہچان نہ سکیں۔ بچّے کا رنگ وہی ہے، آنکھیں وہی ہیں۔ صرف چہرہ ذرا سا مختلف ہے لیکن ایسا بھی فرق نہیں ہے کہ عورتیں اسے فرید کی اولاد تسلیم کرنے سے انکار کر دیتیں۔ یہ فرید کا ہے۔ فرید کا ہی سمجھا جائے گا۔ گوالے اور کھیت مزدوروں نے تمہارے بچّے کو کبھی گود میں لیکر قریب سے نہیں دیکھا تھا اس لیے ان کے فرشتوں کو بھی شبہ نہیں ہو گا۔"

کندن نے خوش ہو کر بچّے کو سینے سے لگا لیا۔ وہ سوکن کا بیٹا تھا مگر خاوند کو اپنے آنچل سے باندھ کر رکھنے کے لیے وہ سگے بیٹے کا کردار ادا کرنے والا تھا اس لیے وہ سگوں سے زیادہ سگا اور عزیز تھا۔

دوسرے دن ماں بیٹی نے آنگن میں آکر دیکھا۔ پچھلے دن جو پھول کِھلے تھے، وہ اب مُرجھا رہے تھے۔ کسی بھی پودے میں ایک بھی نئی کلی نظر نہیں آرہی تھی۔ کندن نے پریشان ہو کر کہا۔

"ماں جی! یہاں گلاب کِھلنے چاہئیں، ورنہ فرید بگڑ جائے گا کہ میں نے اس کے لگائے ہوئے پودوں کی حفاظت نہیں کی ہے۔ اگر ایک آدھ پودا مُرجھاتا تو کوئی بات نہ تھی مگر یہ تو سب کے سب مُرجھا رہے ہیں۔"

بڑھیا نے تشویش سے کہا "پتہ نہیں کیا بات ہے شاید انسان کی کھاد ملنے سے یہ مُرجھا گئے ہیں۔ میں نے کبھی نہیں سُنا کہ پودے کبھی انسانی لہو سے سینچے گئے ہوں۔"

"سُننے کی کیا بات ہے۔" کندن نے کہا "ہم نے بارہا دیکھا ہے کہ قبروں کے سرہانے پھول کِھلتے ہیں، وہاں بھی تو انسان کے گوشت اور لہو کی کھاد ہوتی ہے۔"

باریک بین

شوہر اور بیوی شاپنگ کر رہے تھے۔

بیوی کی نظر ایک خاتون پر پڑی جس نے خاصے کھُلے گلے کی قمیص پہن رکھی تھی۔ اس نے ناگواری سے اپنے شوہر سے کہا۔ "اس لباس میں یہ کتنی بدنما لگ رہی ہے۔"

شوہر نے جواب دیا۔ "جہاں تک میری نظر جاتی ہے ـــــ بالکل نہیں۔"

بڑھیا نے قائل ہو کر سر ہلایا۔ "ہاں۔ تم ٹھیک کہتی ہو۔ یہاں بھی پھُول کِھل سکتے ہیں۔ میں کسی کھیت مزدور سے کہتی ہوں۔ وہ جانتے ہونگے کہ پودے مُرجھائیں تو کیا کرنا چاہیے۔"

اگلے روز کندن اور بڑھیا کے کہنے پر ایک مزدور کنوئیں کے اُس پار گیا۔ گلاب بالکل ہی مُرجھا گئے تھے۔ پتّیاں بھی کہیں کہیں سے سوکھتی جا رہی تھیں۔ وہ پودوں سے ہری شاخیں کاٹ کر نئے سرے سے گلاب کی قلمیں لگانے لگا۔

دو گھنٹے کی محنت کے بعد نئی قلمیں لگ گئیں اور پُرانے پودے اکھاڑ کر پھینک دیے گئے۔ اب وہاں کی زمین ننگی ہو گئی تھی۔ صرف پتلی پتلی ہری شاخیں بھُربھُری مٹّی میں دھنسی ہوئی نظر آتی تھیں۔ کچھ دیر پہلے وہاں جو پودے تھے۔ وہ بیشک مُرجھائے ہوئے تھے مگر ان کے جرم کو چھُپانے کے لیے اس زمین کو اپنی شاخوں اور پتّیوں سے ڈھانپے ہوئے تھے۔

مزدور اس زمین کو پانی سے سینچ کر چلا گیا۔ دونوں ماں بیٹی بہت دیر تک وہاں کھڑی رہیں، اور متوحش نظروں سے یوں دیکھتی رہیں۔ جیسے وہ زمین ابھی ایک قبر کے تعویز کی طرح کھُلے گی اور وہاں سے سُرخ لباس کی پنکھڑیوں میں سمٹی ہوئی گلاب کی کلی اُبھر کر ان کے سامنے آجائے گی اور دونوں ہاتھ پھیلا کر کہے گی۔

"لاؤ۔ میرا بچّہ مجھے واپس دو۔ میں محبت کا وہ ننھا سا حسین تحفہ اپنے فرید کو پیش کروں گی۔"

کندن گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ بڑھیا بھی تصوّر میں وہی منظر دیکھ رہی تھی! اس نے بیٹی کی پیٹھ پہ ہاتھ رکھ کر لرزتی ہوئی آواز میں اُسے تسلّی دی۔

"بیٹی! گھبراؤ نہیں۔ کچھ دنوں کی بات ہے۔ پھر یہاں نئی کونپلیں پھوٹیں گی، شاخیں پھیلیں گی، پتّیاں بکھریں گی اور یہ زمین چھُپ

جائے گی۔ بالکل چھپ جائے گی۔ اوپر پھول کھلتے ہوں تو انکی رنگینیوں کی تہہ میں کسی کا لہو نظر نہیں آتا۔ گھبراؤ نہیں بیٹی! وہ اب تک کیڑوں کی خوراک بن چکی ہوگی ۔۔۔۔“

ماں نے تسلّی دی۔ بیٹی مطمئن ہوگئی۔

پھر دن گذرنے لگے۔ مزدور صبح و شام آکر گلاب کی پتلی پتلی شاخوں کو پانی دیتا تھا۔ پہلے پہل کچھ پتہ نہ چلا۔ ماں بیٹی مایوس ہو رہی تھیں کہ وہ تراشیدہ شاخیں گل نہیں کھلائیں گی۔ پھر ایک صبح ان میں روئیدگی کے آثار نظر آئے۔ محنت رائیگاں نہیں گئی۔ رفتہ رفتہ شاخوں سے شاخیں پھوٹنے لگیں۔ سبز ملائم پتیاں آنکھیں کھولنے لگیں۔ پودے اونچے اور اونچے ہونے لگے۔ کندن کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا! اس نے فرید کے لگائے ہوئے پودوں کو بحال کر دیا تھا۔ زمین کا وہ حصّہ چھپ گیا تھا۔ ان کے جرم پر سرسبز و شاداب پودوں کا پردہ پڑ گیا تھا۔ وہ روز صبح اٹھ کر دیکھتی تھی۔ اب کتنی ہی شاخوں میں کلیاں نظر آنے لگی تھیں۔

ٹھیک ہے کہ تمام ثبوت مر گئے تھے۔ کوئی ان پر انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا لیکن ان کی خوشیاں دیرپا نہیں تھیں۔ ایک صبح انھوں نے کنوئیں کے اُس پار دیکھا تو ان کے کلیجے دھک سے رہ گئے۔

وہاں جتنی کلیاں تھیں، ان کے منہ ذرا سے کھل گئے تھے اور ہر ایک کے منہ پر لہو کی سُرخی جھلک رہی تھی۔

ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ جہاں تک پودے نظر آ رہے تھے، وہاں تک خون کے چھینٹے پھیلے ہوئے تھے۔ وہ مرنے والی ان کلیوں کے کنوارے لبوں پر اپنے لہو کو قطرہ قطرہ تقسیم کر رہی تھی۔

وہ دونوں لرزتے ہوئے قدموں سے جھجکتی ہوئی ذرا قریب آکر دیکھنے لگیں۔

”یہ کیا ہوگیا ـــ یہ کیا ہو رہا ہے؟ ماں جی۔ ماں جی اُس کا خون چھلک رہا ہے ۔۔۔۔“

”نن نہیں بیٹی! ہوش کی باتیں کرو۔ یہ خون نہیں ہے۔ یہ سُرخ کلیاں ہیں۔“

ہاں وہ سُرخ کلیاں تھیں۔ شام کو وہ ذرا اور کھِل گئیں اور دوسری صبح پھول بن گئیں۔ سُرخ گلاب کے پھول ـــ جیسے وہ پھول نہیں تھے ـــ شادو کا سُرخ پیرہن تھا اور وہ اس پیرہن میں چھپی ہوئی یہاں کھِل رہی تھی۔ وہاں مسکرا رہی تھی۔ اِدھر خوشبو لٹا رہی تھی، اُدھر شاخوں کے جھولے پر جھول رہی تھی ۔۔۔۔

کندن بوکھلائی سی اِدھر اُدھر بھاگ رہی تھی۔ کبھی کنوئیں کے پاس بیٹھ رہی تھی، کبھی اٹھ کر دُور چلی جاتی تھی! اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے؟ کتنے پھولوں کو قتل کرے؟ کتنوں کو دفن کرے؟ دفن کریگی تو اتنے ہی پھول اور کھلیں گے ـــ جو چپ رہے گی زبانِ خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا ـــ شادو مٹی کی تہہ سے پکار رہی تھی۔

آہ! اب وہ ان پودوں کو اکھاڑ کر نہیں پھینک سکتی تھی۔ فرید کی سزا کی میعاد پوری ہو چکی تھی۔ وہ کسی بھی وقت وہاں پہنچ سکتا تھا۔ وہ بڑے فخر سے کہنا چاہتی تھی کہ دیکھو فرید میں نے تمہارے لگائے ہوئے پودوں کی حفاظت کی ہے مگر ـــ مگر ـــ جہاں سفید گلاب کھلتے تھے ـــ وہاں سُرخ گلاب کیسے کھِل رہے ہیں؟

کیسے کھِل رہے ہیں؟ اس کا جواب پودے، مٹی اور کھاد کے رشتے ہی دے سکتے ہیں۔ یا پھر شادو کی خاموش دُعا کچھ کہہ سکتی ہے۔

”ربّا! مجھے ایسی زندگی دے جو سانسوں کی محتاج نہیں ہوتی جیسے سُرخ گلاب، جو سانس نہیں لیتا مگر ہنستا، کھِلتا، مسکراتا اور مہکتا رہتا ہے ـــ تو مجھ سے عورت کی زندگی چھین رہا ہے تو چھین لے مگر ایک گلاب کی زندگی دے دے۔ میں اپنے فرید کے سامنے ہمیشہ مسکرانا چاہتی ہوں ـــ ربّا! تو بہت بڑا ہے اور میری دُعا بہت چھوٹی ہے ـــ قبول کر لے ۔۔۔۔!“

اور وہ لہو کے گلاب مسکرا رہے تھے۔

وہ جیل سے رہا ہو کر ایگریکلچر ڈیپارٹمنٹ کے ایک دفتر میں آیا۔ وہاں اپنے ایک دوست ظفر علی کے پاس اس نے پانچ سو روپے رکھے تھے۔ اب وہ جیل سے خالی ہاتھ نکلا تھا۔ لہٰذا اسے روپے کی ضرورت تھی۔ ظفر علی بڑے تپاک سے ملا اور اسے اپنے گھر لے گیا۔ فرید نے اس سے کہا۔

”ظفر! میں یہاں زیادہ دیر رُکنا نہیں چاہتا۔ ابھی دوپہر کی ٹرین سے لاہور جاؤں گا۔“

”لاہور؟“ اس نے تعجب سے کہا۔ ”تین ماہ بعد جیل سے رہا ہو کر آ رہے ہو۔ وہاں عثمان گوٹ میں تمھاری بیوی تمھارا انتظار کر رہی ہوگی اور تم لاہور جانا چاہتے ہو؟“

”ہاں۔ وہاں بھی کسی کو میرا انتظار ہے۔“ فرید نے سر جھکا کر ندامت سے کہا۔ ”میں اس پر ظلم کر رہا ہوں۔ میں اپنے آپ پر ظلم کر رہا ہوں۔ اب یہ سلسلہ ختم ہو جانا چاہیے۔ اسی لیے میں لاہور جانا چاہتا ہوں۔ لاہور سے جڑانوالہ جاؤں گا اور اسے ساری حقیقت بتا دوں گا۔ نہیں۔ بتاؤں گا نہیں بلکہ اسے اپنے ساتھ عثمان گوٹ لے آؤں گا۔ وہاں پہنچ کر اسے پتہ چل جائے گا کہ میں نے دوسری شادی کی ہے۔“

”دوسری شادی ـــ؟“ ظفر نے حیرانی سے پوچھا۔ ”کیا تم نے جڑانوالہ میں دوسری شادی کی ہے؟“

”نہیں۔ وہ میری پہلی شادی تھی۔ شادو میری پہلی بیوی ہے۔ سُنا تھا کہ شادی کے بعد عورت رسمی طور پر بیوی بن کر رہ جاتی ہے۔ اس میں پہلی

جیسی محبوبیت نہیں رہتی لیکن وہ اتنی اچھی، اتنی حسین اور ایسی محبت کی ماری ہے کہ میں آج بھی ایک عاشق کی طرح اس کے لئے تڑپتا رہتا ہوں۔"

"تم نے پہلے اُس کا ذکر نہیں کیا ــــ؛ مجھ جیسے دوست سے یہ بات چھپانے کا مطلب یہ ہے کہ شادو کے پیچھے کوئی گہرا راز ہے۔"

"کوئی راز نہیں ہے۔ وہاں لاہور میں میں بڑے فخر سے کہا کرتا تھا کہ مجھے شادو جیسی بیوی ملی ہے مگر یہاں عثمان گوٹھ میں جب سے دوسری شادی کی ہے اُس وقت سے میں خود کو ایک مجرم سمجھ رہا ہوں ــــ کیا شادو جیسی محبت کرنے والی حسین اور وفاشعار بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کرنا جرم نہیں ہے؟"

"ہاں۔ مگر تم نے ایسا کیوں کیا؟"

وہ سرد آہ بھر کر بولا۔ "مجبوری تھی ــــ یا یہ سمجھ لو کہ انسان اپنی زندگی میں کبھی کبھی زبردست حماقتیں کرتا ہے۔ مجھ سے بھی یہ حماقت ہوگئی۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مجھ سے ایسی غلطی ہوجائے گی۔

جب شادو میری دُلہن بن کر آئی تھی تو اُن دنوں میں بہت غریب تھا۔ آمدنی کا کوئی معقول ذریعہ نہ تھا۔ مل گئی تو روزی نہیں تو روزے والی بات تھی ــــ شادو نے میرے ساتھ رہ کر دو دو چار چار وقت کے مسلسل فاقے کئے ہیں۔ یہ سوچ کر مجھے ندامت سی ہوتی ہے کہ وہ میرے بُرے وقتوں کی ساتھی تھی اور اچھا وقت آیا ہے تو میں اُسے اپنے سے دُور رکھتا ہوں کہ کہیں اُس پر دوسری شادی کا بھید نہ کھُل جائے۔ میں ڈرتا ہوں۔ وہ میری غربت کو برداشت کرسکتی ہے لیکن میری بے وفائی کا صدمہ برداشت نہیں کرے گی۔

مفلسی کے دنوں میں ہمارے خواب ایک جیسے تھے ہم دونوں سوچتے تھے کہ کبھی ہمارے دن پھریں گے۔ ہمارا ایک چھوٹا سا مکان ہوگا اور اس کے آنگن میں گلاب کھلیں گے ــــ سُرخ گلاب کے پھُول ــــ مجھے سُرخ گلاب پسند ہیں ــــ آج بھی جب وہ سُرخ لباس پہنتی ہے تو اس گلاب سے مکھڑے کو دیکھ کر میرے خواب پورے ہوجاتے ہیں۔

پھر مجھے زمینیں حاصل کرنے کا موقع مل گیا۔ محکمۂ زراعت سندھ کے افسران نے ایک اسکیم بنائی کہ غلام محمد بیراج اور سکھر بیراج سے نہریں نکال کر دُور افتادہ علاقوں تک پہنچائی جائیں تو سندھ کی بنجر زمینیں کاشتکاری کے قابل بنائی جاسکتی ہیں۔ حکومت نے اعلان کیا کہ ان علاقوں میں ہل چلانے والے کسانوں کو مفت زمینیں دی جائیں گی۔

وہ بنجر زمین جو صدیوں کی پیاسی تھی، جہاں کبھی سبزہ نہیں اُگتا تھا وہاں کی دھرتی پر ہل چلانا اور فصل اُگانا جوئے شیر لانے کے برابر تھا ــــ تم اس محکمہ میں ہو۔ تم جانتے ہو کہ آج بھی یہ کسان ان علاقوں میں کس طرح اپنا خون پسینہ ایک کررہے ہیں ــــ مجھے بھی اپنے حوصلوں کو آزمانے کا موقع ملا۔ میں شادو کو اس کے میکے میں چھوڑ کر یہاں آگیا۔ یہاں مجھے عثمان گوٹھ میں زمین مل گئی۔ میری زمینوں کے ساتھ جو دوسری زمینیں تھیں، وہ بورے والا کے ایک بوڑھے زمیندار رحیم بخش کو ملی تھیں۔ وہ بوڑھا اپنے جوان بیٹے کے ساتھ کھیتی باڑی کے لئے آیا تھا۔ یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ چھ ماہ کے بعد اس کا جوان بیٹا مرگیا۔

میں نے بوڑھے رحیم بخش کو تسلّی دی کہ وہ حوصلہ نہ ہارے۔ میں اُس کے کھیتوں کا کام سنبھالوں گا ــــ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ ہمدردی مجھے مہنگی پڑے گی۔ میں نے پوری دیانت داری سے اس کا کام سنبھالا۔ کھیت مزدوروں کے ساتھ مل کر دن رات محنت کی۔ وہاں کی مٹّی کو ہلوں سے اور کسان کی محنتوں سے آشنا کیا۔ کھیت جاگے، فصلیں جوان ہوئیں، آمدنی بڑھی۔ میں نے رہائش کے لئے ابھی مکان نہیں بنایا تھا۔ ورنہ شادو کو اپنے پاس بلالیتا۔ لیکن اُسے زیادہ سے زیادہ پیسے بھیجتا رہا۔ سال میں دو ایک بار اُس سے ملنے چلا جاتا تھا۔ بوڑھے رحیم بخش نے اپنا مکان بنوالیا تھا۔ اس لئے اُس نے اپنی بیوی اور بیٹی کو اپنے پاس بلالیا۔

وہی بیٹی ــــ جو آج میری دوسری بیوی ہے۔

میں نے کبھی رحیم بخش کے سامنے شادو کا ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ بوڑھا تھا اور میں جوان ــــ لہٰذا ایک بوڑھے کے سامنے اپنی جوان بیوی کی محبّت کی داستان لیکر بیٹھنا حماقت تھی اور جب اس گھر میں ایک جوان لڑکی آئی تو میں مزید حماقتوں میں مبتلا ہوگیا۔ لڑکی بیباک تھی۔ گرم گرم نگاہوں سے دیکھتی تھی مسکراتی تھی، کبھی موقعہ ملے تو چھیڑ کر گزر جاتی تھی۔ میں دن بھر کی محنت سے تھکا ہوا آتا تھا۔ شادو سے سینکڑوں میل دُور تھا۔ اِدھر کندن اپنی اداؤں سے اور معنی خیز اشاروں سے سمجھاتی تھی کہ میری تھکن دُور ہوسکتی ہے۔

ایک رات وہ میری چارپائی پر آگئی۔ اُمڈی ہوئی جوانی، بپھرتا ہوا بدن اور بپھرے ہوئے جذبات کچھ سوچنے کا موقع نہیں دیتے۔ میری سمجھ میں اتنا ہی آیا کہ عورت ایک کھیتی ہے، مرد ایک کسان ہے جو زرخیز مٹّی سے کھیلتا ہے، اس کے نشیب و فراز سمجھتا ہے، اُسے ہموار کرتا ہے، اس میں آرزوؤں کے بیج بوتا ہے اور اپنی محنت کا ہل چلاتا ہے۔ وہ وقت ایسا تھا کہ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں سوچ سکتا تھا۔ جب وقت گزر گیا، جب جذبات سرد پڑ گئے تو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور تب دیر ہوچکی تھی۔ رحیم بخش اور اس کی بیوی کی آنکھ کھُل گئی تھی۔ وہ دونوں اپنے کمرے سے نکل آئے تھے اور انہوں نے کسان اور زمین کے رشتے کو دیکھ لیا تھا۔

اب یہ کہنے کا وقت نکل چکا تھا کہ میں شادی شدہ ہوں اور وہ بھی میری یہ بات سننے کے مقام سے آگے نکل چکے تھے۔ بوڑھے نے سر جھکا کر کہا۔

"میں نے کھیت تمہارے حوالے کردیئے۔ بیٹی بھی تمہارے

حوالے کرنے والا تھا ــــ بہرحال اس سلسلے میں بات بڑھانا دانشمندی نہیں ہے۔ اس میں ہم سب کی بدنامی ہے۔ کل صبح تم دونوں کا نکاح پڑھا دیا جائے گا۔"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ بڑھیا بھی چلی گئی۔ اس کی بیٹی بھی چلی گئی۔ اور میں تنہا ایک مجرم کی طرح بیٹھا رہ گیا۔ چوری پکڑی گئی تھی اس لئے میں بوڑھے کے فیصلے سے انکار نہ کرسکا۔

اب کندن میری بیوی ہے۔ یہ بات میں آج تک شادو کو نہ بتا سکا۔ کئی بار بتانے کی کوشش کی۔ مگر اس کی محبت، اس کی معصومیت اور اس کا بے پناہ اعتماد دیکھ کر میں چوروں کی طرح چپ سادھ لیتا ہوں۔ وہ ضد کرتی ہے کہ میں اسے اپنے ساتھ یہاں لے آؤں۔ لیکن میں بہلانے کرتا ہوں، باتیں بناتا ہوں کہ یہاں کی آب و ہوا اچھی نہیں ہے، پانی کی قلت ہے، کھانے پینے کی چیزیں میلوں دور سے لانی پڑتی ہیں، آس پاس کوئی مکان نہیں ہے، چور ڈاکوؤں کا خطرہ رہتا ہے۔ ایسی صورت میں میں اسے اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔

ہزار سمجھانے کے باوجود وہ بضد ہے کہ میرے ساتھ رہے گی۔ آخری بار اُس سے مل کر آیا تو یہ وعدہ کیا تھا کہ چار ماہ کے بعد اُسے بلاؤں گا۔ ایک ماہ کے بعد اس کا خط آیا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ اُسے کچھ دن اور ٹالنے کا بہانہ مل گیا۔ میں نے لکھ دیا کہ زچگی کے بعد میں اُسے لے آؤں گا۔ میں بہت مجبور ہو کر اُسے ٹال رہا تھا۔ مگر اب میری بے چینی بڑھ گئی تھی۔ ایک تو شادو کی محبت ہی کچھ کم نہ تھی دوسرے وہ میرے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ اس طرح وہ اپنی محبت کو میری آئندہ نسل تک پہنچا رہی تھی۔ اس بار میں نے فیصلہ کرلیا کہ اس کی زچگی کے بعد اُسے ضرور یہاں لے آؤں گا۔ اور یہ بات میں نے کندن کو بتا دی۔ اپنی سوکن کا ذکر سن کر وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ اس کی بوڑھی ماں نے مجھے بُرا بھلا کہتے ہوئے یہ بات بتائی کہ کندن بھی ماں بننے والی ہے۔ ایسے وقت اسے صدمہ پہنچانے والی باتیں نہیں کرنا چاہیئے۔ کندن کا باپ رحیم بخش چھ ماہ پہلے اس دنیا سے رخصت ہوگیا تھا۔ دونوں ماں بیٹی میرے رحم و کرم پر ہیں۔ میں نے انہیں ڈانٹ ڈپٹ کر خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔ ایسے وقت عورت پر رُعب جما کر ہی اسے مجبور کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی سوکن کو برداشت کرلے۔ اور میں جانتا ہوں، شادو بھی اسی طرح تھوڑی دیر روئے گی پھر حالات سے سمجھوتہ کرلے گی۔ میری کمزوری صرف اتنی سی ہے کہ میں شادو کے آنسو نہیں دیکھ سکتا۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگیا۔ ظفر علی نے کہا۔

"شادو کے آنسو تو دیکھنے ہی پڑیں گے۔ غلطی تم نے کی ہے زندگی بھر رونے کی سزا اُسے ملے گی۔"

"خدا نہ کرے کہ اُسے میری غلطی کی سزا ملے۔ میں اُسے کسی نہ کسی طرح منا لوں گا۔"

وہ اپنی نگاہوں کے سامنے شادو کی تصویر بنانے لگا۔ کاجل بھری کٹورا سی آنکھیں، دودھ جیسے اُجلے چہرے پر چھلکتی ہوئی گلابی رنگت، لبوں کی لالیاں گمشدہ بوسوں کو پکار رہی تھیں۔ سنہری زُلفیں شانوں پر مچلنے کے لئے لہرا رہی تھیں۔ جتنے رنگ گلاب کے پھولوں میں نہیں ہوتے، اُتنے رنگ اس ایک حسینہ میں سمٹ آئے تھے۔

"شادو ــــ! میری گلاب کی کلی ــــ! تم عثمان گوٹھ آؤ گی تو میں تمہیں دکھاؤں گا۔ میں نے مکان کے آنگن میں گلاب کے پودے لگائے ہیں۔ مگر وہاں سفید گلاب کھلتے ہیں۔ تم آؤ گی تو ان گلابوں میں شاید تمہارے شہابی وجود کی رنگت گھل جائے گی.......۔"

وہ رنگت گھل چکی تھی ــــ اور وہ سوچنے والا خیال ہی خیال میں اسے اس آنگن تک بلا رہا تھا۔ جہاں وہ پہلے ہی پہنچ گئی تھی۔ اور اپنے لہو کی سُرخی میں ڈوب کر اس کا انتظار کر رہی تھی۔

"آؤ فرید ــــ! تم اپنے آنگن میں پھول کھلانا چاہتے تھے، آؤ ــــ! میں سُرخ پیرہن میں کھل گئی ہوں۔

سہاگ رات کو تم نے سُرخ گھونگھٹ اُٹھا کر کہا تھا کہ میں تمہاری نگاہوں کی آسودگی کے لئے کبھی کبھی وہ لباس پہن لیا کروں ــــ سو میں نے سدا سہاگن کا وہ لباس پہن لیا ہے ــــ آؤ! مجھے پہچان سکو تو پہچان لو..........۔"

ابھی آنگن اس سے دور تھا۔ وہ اپنی محبوبہ سے ملنے اس کے میکے کی طرف چلا گیا۔

وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ شادو نے اسے کئی خط لکھے، صرف پہلے خط کا اسے جواب ملا۔ اس کے بعد فرید کی مسلسل خاموشی سے وہ پریشان ہوگئی اور زچگی کے پندرہ دن بعد تیئس جون کو وہاں سے عثمان گوٹھ چلی گئی۔ تب سے اس کی کوئی خبر نہیں ملی ہے اور نہ ہی اس نے میکے والوں کو خط لکھا ہے۔

فرید اسی دن وہاں سے لوٹ گیا۔ سفر کے دوران وہ سوچتا رہا کہ شادو کو ایک ننھی سی جان کے ساتھ تنہا اتنا طویل اور انجانا سفر نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ پھر اُس نے سوچا کہ وہ بیچاری اور کیا کرتی۔ برسوں کے بہلاوے اور انتظار سے گھبرا گئی تھی۔ اسے خطوط کے جوابات نہیں مل رہے تھے۔ کوئی خبر نہیں مل رہی تھی کہ خاوند کہاں گم ہوگیا ہے۔ اس لئے وہ پریشان ہو کر اس کی تلاش میں نکل گئی تھی ــــ وہ بھی مجبور تھی، یہ بھی مجبور تھا۔ شادو کا دوسرا تیسرا خط آیا تھا لیکن وہ رحیم گوٹھ کے زمیندار سے نہری پانی کے جھگڑوں میں اُلجھا ہوا تھا۔ تھانہ کچہری اور کھیتی باڑی کے

اُلجھنوں سے فرصت نہیں مل رہی تھی۔ پھر عدالت کا فیصلہ اس کے خلاف ہوگیا تو وہ تین ماہ کے لئے جیل کی چار دیواری میں قید ہوگیا۔ انہی اُلجھنوں اور بکھیڑوں کا نام زندگی ہے۔

جڑانوالہ سے شورکوٹ — شورکوٹ سے شہداد پور — پھر وہاں سے عثمان گوٹ — شادو اس کی تلاش میں ان راستوں سے گزرتی آئی تھی۔ اب انہی راستوں پر وہ شادو کو تلاش کرتا آرہا تھا۔

اپنے کھیتوں سے گزرتے ہوئے اُس نے مزدوروں سے پوچھا۔ "میرے ہاں کوئی عورت آئی ہے جس کے ساتھ ایک بچہ ہے؟"

"نہیں۔" جواب ملا — اُس نے مایوسی اور پریشانی سے پوچھا۔ "کوئی مہمان عورت — یا ایسی عورت جو مجھے تلاش کرتی آئی ہو اور پھر چلی گئی ہو؟"

"نہیں — یہاں صرف بستی کی عورتیں آتی ہیں۔ گھر میں مالکن اور بوڑھی مائی کے سوا ہم نے کسی کو نہیں دیکھا — ہاں، آپ کے ہاں بیٹا ہوا ہے۔ بہت ہی خوبصورت ہے۔ میری گھر والی کہہ رہی تھی کہ وہ بالکل آپ جیسا ہے۔"

فرید کسی خوشی کا اظہار کئے بغیر لانبے ڈگ بھرتا ہوا اپنے مکان کی طرف جانے لگا۔ اسے گھبراہٹ سی ہو رہی تھی کہ شادو یہاں تک کیوں نہیں پہنچی؟ صحیح پتہ معلوم ہوتے کے باوجود وہ کہاں بھٹک گئی ہے —؟ کہیں وہ اکیلی عورت کسی بدمعاش کے ہتھے نہ چڑھ گئی ہو۔

اس نے دروازے پر پہنچ کر زور زور سے دستک دی۔ دروازہ کھلنے میں دیر ہوئی تو وہ دھڑا دھڑ گھونسے برسانے اور چیخنے لگا۔

"کندن —! دروازہ کھولو۔ کیا مر گئی ہو، سنائی نہیں دیتا ہے؟"

فرید کی آواز سنتے ہی کندن آنگن سے دوڑتی ہوئی کمرے میں آئی اور خوشی سے چیختی ہوئی بولی۔ "آتی ہوں — آرہی ہوں — ابھی دروازہ کھولتی ہوں۔ وہ بھاگتی ہوئی چارپائی کے پاس آئی اور وہاں سے بچے کو اٹھا کر گنگناتی ہوئی آواز میں بولی۔

"اُٹھ مُنّے! دیکھ تیرا باپ آیا ہے۔ وہ تجھے دیکھتے ہی مارے خوشی کے مجھے چوم لے گا۔"

وہ لہراتی اور اٹھلاتی ہوئی دروازے کے پاس آئی اور اسے کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی فرید نے بیتابی سے پوچھا۔

"شادو یہاں آئی ہے؟"

کندن کے دماغ میں ہتھوڑا سا لگا۔ پل بھر کے لئے یوں لگا جیسے فرید کو یہاں شادو کی آمد کا کوئی ثبوت مل گیا ہے۔ تب ہی وہ جیل سے آتے ہی پورے یقین سے کہہ رہا ہے کہ شادو یہاں آئی ہے۔ مگر دوسرے ہی لمحے

وہ سنبھل کر بولی۔ "شادو —؟ کون شادو —؟ کیا وہی جو تمہاری سگی ہے —؟ وہ بھلا میرے پاس کیوں آئے گی؟"

"وہ آئی ہے —!" اُس نے پاؤں پیٹخ کر چیختے ہوئے کہا۔ "وہ یہاں آئی ہے۔ میں اُس کے میکے سے آرہا ہوں۔ انہوں نے بتایا ہے کہ وہ دو ماہ پہلے اپنے گھر سے نکلی ہے۔ مجھ سے ملنے یہاں آئی ہے۔"

وہ ناگواری سے بولی۔ "وہ یہاں آتی تو کیا میں اُسے کنویں

میں پھینک دیتی یا اُسے کچّا کھا جاتی یا اُسے ذبح کر دیتی ۔۔۔ کیسی باتیں کرتے ہو ۔۔۔ اتنی اُونچی پوری عورت بھلا کہیں چھُپ سکتی ہے ؟ میری بات کا یقین نہیں ہے تو گھر میں آ کے دیکھ لو ۔ تم تو دروازے پر ایسے کھڑے ہو جیسے کوئی پولیس والے ہو ۔ جیسے یہ تمہارا گھر نہیں ہے، میں تمہاری نہیں ہوں، یہ بچہ تمہارا نہیں ہے ...."

بچّے کے ذکر پر فرید نے پہلی بار اس ننھّی سی جان کو دیکھا تو چند لمحوں کے لئے نظریں اس پر جم کر رہ گئیں ۔ وہ دہلیز پار کر کے قریب آیا اور جُھک کر غور سے اسے دیکھنے لگا ۔ کندن یوں فاتحانہ انداز میں کبھی بچّے کو اور کبھی فرید کو دیکھ رہی تھی ۔ جیسے کوئی شکاری جال بچھا کر کبھی اپنے جال کو اور کبھی اُلجھنے والے شکار کو دیکھتا ہے ۔

فرید کچھ اور ہی دیکھ رہا تھا ۔ نہ جانے کیوں اُس بچّے کو دیکھتے ہی شادو کچھ اور شدّت سے یاد آ گئی تھی ۔ اس بچّے میں کوئی بات تھی ۔ کوئی ایسی چیز تھی جو اپنی بچھڑی ہوئی ماں کی نمائندگی کر رہی تھی ۔ حالانکہ آنکھیں باپ کی طرح نیلی تھیں، ناک نقشہ بھی باپ ہی سے ملتا جلتا تھا ۔ مگر ہاں ۔۔۔ اس کے بال سنہرے تھے ۔ جبکہ فرید اور کندن کے بال سیاہ تھے ۔ وہ سنہری چمک اسے اپنی ماں سے ملی تھی ۔

ان سنہرے بالوں کو دیکھ کر اسے شادو کی سنہری زُلفیں یاد آ رہی تھیں ۔۔۔ کندن کی کوکھ سے جنم لینے والا بچہ سینکڑوں میل دُور رہنے والی شادو کی سنہری چمک کیسے چُرا لایا ۔۔۔ ؟ یہ سوال ذرا دیر کے لئے اس کے ذہن میں اُبھرا پھر ڈوب گیا کہ یہ محض اتفاق ہے ایسے اتفاقات قدرت کی بوالعجبی سمجھے جاتے ہیں ۔ پھر یہ کہ اس وقت وہ شادو کے لئے فکرمند تھا ۔ اس نے کندن کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے کہا

"تم نے مجھے بہت ہی خوبصورت بیٹا دیا ہے ۔ میں اسے پیار کروں گا ۔ خوب پیار کروں گا ۔ مگر ابھی میں بہت پریشان ہوں ۔ شادو کو تلاش کرنے جا رہا ہوں ۔ نہ جانے وہ صحیح پتہ سے بھٹک کر کہاں چلی گئی ہے ؟"

یہ کہہ کر وہ پلٹ گیا اور تیزی سے چلتا ہوا کندن کی نظروں سے اوجھل ہو گیا ۔ وہ ذرا دم لینے کے لئے بھی کمرے میں آ کر نہیں بیٹھا ۔ اُس نے کندن کی خیریت بھی نہیں پوچھی اور پلٹ کر چلا گیا ۔ ٹھیک ہے کہ وہ پریشان تھا ۔ مگر وہ پریشانی سوکن کے لئے تھی ۔ اس لئے دل میں چرکے لگ رہے تھے ۔

وہ خود کو سمجھانے لگی کہ کوئی بات نہیں ۔۔۔ ایک خاوند اپنی گمشدہ بیوی کے لئے کتنے دنوں تک پریشان رہے گا ؟ ابھی اسے تلاش کرنے دو ۔ وہ تھک ہار کر صبر کرنے پر مجبور ہو جائے گا ۔ پھر میں تنہا اس کی نگاہوں کا مرکز بنی رہوں گی ۔۔۔ یہی کیا کم ہے کہ اس نے میری تعریف کی ہے کہ میں نے اس کے لئے ایک خوبصورت بیٹا پیدا کیا ہے ۔

اس نے بچّے کو سینے سے لگا کر چُوم لیا ۔۔۔ بیچاری مرنے والی نے اس کے لئے اس بچّے کو جنم دیا تھا ۔

فرید بستی میں جا کر جان پہچان والوں سے شادو کے متعلق پوچھتا رہا ۔ پھر اُس نے تھانہ میں جا کر رپورٹ لکھوا دی ۔ تھانیدار نے کہا کہ وہ تیس جون کو جڑانوالہ سے چلی تھی ۔ لہٰذا پہلی جولائی کو شہداد پور پہنچی ہو گی ۔ میں ریلوے پولیس کے رجسٹر سے معلوم کروں گا کہ پہلی جولائی کو شہداد پور کے اسٹیشن پر کون اور کتنے سپاہی ڈیوٹی پر تھے ۔ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے ایک تنہا عورت کو بچّے کے ساتھ دیکھا ہو ۔ تم شادو کی ایک تصویر ہمیں لا کر دو ۔ اگر وہ شہداد پور تک آئی ہو گی تو کوئی نہ کوئی اسے پہچان لے گا ۔

فرید گھر آیا اور وہاں سے شادو کی ایک تصویر لیکر تھانہ پہنچا دی ۔ اس کے بعد بھی وہ اطمینان سے نہیں بیٹھ سکا ۔ آس پاس کے زمینداروں کے ہاں جا کر پوچھتا رہا ۔ جن سے جھگڑا کر کے جیل گیا تھا ۔ ان کے ہاں بھی گیا مگر ناکامی ہوئی ۔ کسی نے شادو کا سایہ تک نہیں دیکھا تھا ۔

وہ آدھی رات کو گھر آیا ۔ تھکن سے چُور تھا ۔ نہ بچّے کو چُوم سکا اور نہ ہی کندن سے محبت کے دو بول کہہ سکا ۔ بستر پر گرتے ہی گہری نیند سو گیا ۔

کندن تمام رات اپنی چارپائی پر کروٹیں بدلتی رہی اور فرید کی بے اعتنائی اور بے مروّتی پر جھنجھلاتی رہی ۔ اتنے دنوں بعد آیا تھا اور ایسے الگ تھلگ سو رہا تھا جیسے آپس میں سونے کا رشتہ نہ ہو ۔ وہ صبح اٹھی تو روٹھی ہوئی تھی ۔ فرید نے اس کی طرف دھیان نہیں دیا ۔ آنکھ کھلتے ہی وہ پھر شادو کی گمشدگی کے متعلق سوچ رہا تھا ۔

وہ بستر سے اُٹھ کر سوچ میں ڈوبا ہوا کمرے سے باہر آیا ۔ اتنے دنوں بعد پہلی بار آنگن میں آیا ۔ پھر سُرخ گلابوں کو دیکھتے ہی اس کا دل بے اختیار دھڑکنے لگا ۔ اس نے خوشی سے چیختے ہوئے کندن کو آواز دی ۔

"کندن ۔۔۔ تم نے مجھے بتایا نہیں کہ ہمارے ہاں سُرخ گلاب کھل رہے ہیں ۔۔۔ یہ سب کیسے ہو گیا ؟ ۔۔۔ یہ کیسے ممکن ہے ؟ ۔۔۔ سفید گلاب سُرخ کیسے ہو گئے ؟"

بڑھیا نے باورچی خانے سے نکل کر کہا ۔ "بیٹا ۔۔۔ ایہ سب خدا کی قدرت ہے ۔ تم نے جو پودے لگائے تھے وہ سُوکھ چلے تھے تمہارے مزدوروں نے انہی پودوں کی ہری شاخیں کاٹ کر دوبارہ لگا دی تھیں تمہیں یہ پسند ہیں اس لئے کندن دن رات اُن کی دیکھ بھال کرتی ہے ۔"

فرید پودوں کے قریب پہنچ گیا تھا ۔ اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں ۔ وہ دیوانہ وار ایک ایک پودے کے قریب جا رہا تھا ۔ ایک ایک گلاب کو دیکھ رہا تھا ۔ ان کی ریشمی پنکھڑیوں کو لرزتی ہوئی

انگلیوں سے چھو رہا تھا۔ کندن دروازے پر کھڑی دانت پر دانت جمائے، ہونٹوں کو سختی سے بھینچے، اُن گلابوں کو دیکھ رہی تھی ۔۔۔ نہیں! اپنی سوکن کو دیکھ رہی تھی۔

فرید نے اُسے اتنی توجّہ سے نہیں دیکھا تھا مگر گلابوں کو دل کی گہرائیوں سے دیکھ رہا تھا۔

اسے ہاتھ نہیں لگایا تھا مگر سوکن کے سُرخ پیرہن کو چھو رہا تھا۔

اب وہ ایک پودے کے قریب دوزانو ہوگیا تھا اور ایک گلاب کو دونوں ہاتھوں سے یوں تھام رہا تھا جیسے شادو کے شہابی مُکھڑے کو ہتھیلیوں کے گلدان میں سجا رہا ہو۔

وہ گلاب کی پتّیوں میں چھپی ہوئی شبنم کے آنسو رو رہی تھی۔ شاید وہ خوشی کے آنسو تھے کہ ایک مدت کے بعد محبوب کی قربت نصیب ہوئی تھی۔

فرید بڑی محبّت اور بڑی لگن سے اُسے دیکھ رہا تھا اور آہستہ آہستہ اس کے چہرے پر جُھک رہا تھا۔ پھر اس نے اپنے پیاسے ہونٹ اُس پر رکھ دیئے اور اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

اور تب آنکھیں بند کرتے ہی اُسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے اس کی تلاش ختم ہوگئی ہو۔ وہ جانِ بہار اس کے ہونٹوں کے سائے میں ہے۔ وہی رنگ، وہی روپ، وہی جذبوں سے مہکتی ہوئی گلابی خوشبو، وہی گلبدن کی نزاکت اور ملائمت جو سمٹے تو پھول اور انگڑائی کی اُٹھان پر آئے تو شادو کا سراپا بن جائے۔

آگ لگ رہی تھی ۔۔۔ آگ لگ رہی تھی ۔۔۔ کندن جل رہی تھی۔ وہ سُرخ گلاب نہیں تھے، انگارے تھے جو اس کے جسم کے ایک ایک حصّہ کو داغ رہے تھے۔ وہ تڑپ رہی تھی اور اپنے اندر چیخ رہی تھی۔ "اری کمینی ۔۔۔! تجھے کس لئے مارا تھا؟ کیا اس لئے کہ مرنے کے بعد بھی تُو مجھے جلاتی رہے اور سوکن بن کر میرے خاوند کا راستہ کاٹتی رہے۔ کل سے میری سیج سُونی ہے۔ ہائے، وہ میری طرف نظر اُٹھا کر نہیں دیکھتا ۔۔۔۔۔۔"

وہ دوڑتی ہوئی اپنی ماں کے کمرے میں چلی گئی اور بستر پر اوندھے مُنہ گر کر رونے لگی۔

تھوڑی دیر بعد ماں نے آکر بتایا کہ فرید ناشتہ کئے بغیر تھانے کی طرف چلا گیا ہے ۔۔۔ بس یہی باتیں جی کو جلاتی تھیں کہ اسے کھانے پینے کا ہوش نہیں ہے، بیوی بچّے کی پرواہ نہیں ہے، رات کو مسافر کی طرح آیا اور صبح اُٹھ کر سوکن کو گلے لگایا، اسے پیار کیا اور چلا گیا۔

وہ غصّے میں طنطناتی ہوئی کمرے سے نکلی، آنگن میں آئی اور غرّاتی ہوئی ان گلابوں کو دیکھنے لگی۔ پھر وہ پاؤں پٹختی ہوئی اُس پھول کے پاس آگئی جسے وہ چُوم کر گیا تھا۔ اس کے تن بدن میں آگ لگی ہوئی تھی۔ وہ غصّے کی شدّت سے کانپ رہی تھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے دائیاں ہاتھ اُٹھایا اور پوری قوت سے اُس پھول کو ایک طمانچہ رسید کردیا

"ہائے ۔۔۔!" ایک زور کی چیخ بلند ہوئی۔

وہ پھول کی چیخ نہیں تھی۔ کندن چیختی چلاتی وہاں سے بھاگی آرہی تھی۔ ماں نے کمرے سے نکل کر پریشانی سے پوچھا۔

"کیا بات ہے بٹیا ۔۔۔؟ کیا ہوگیا ۔۔۔۔۔؟"

بٹیا بیچ آنگن میں آکر گر پڑی تھی اور دہشت زدہ سی ہو کر کبھی پھول کی جانب دیکھ رہی تھی اور کبھی دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو ۔۔۔ اس ہتھیلی پر خراشیں پڑی ہوئی تھیں اور ان میں سے خون کی سُرخی جھلک رہی تھی۔

کانٹوں نے طمانچے کا جواب دیا تھا اور وہ پھول جُوں کا تُوں اُن کانٹوں کی آغوش میں مسکرا رہا تھا۔

♥

فرید تھانیدار کے ساتھ شہداد پور گیا تھا۔ پہلی جولائی کو جن سپاہیوں کی ڈیوٹی اسٹیشن پر تھی۔ اُن میں سے ایک سپاہی نے شادو کی تصویر پہچان کر کہا کہ اس عورت کو اس نے اسٹیشن ماسٹر کے ساتھ دیکھا ہے ۔۔۔ اسٹیشن ماسٹر نے بتایا کہ وہ عورت عثمان گوٹھ کا راستہ پوچھتی ہوئی اس کے پاس آئی تھی۔ اس نے فلاں گدھا گاڑی والے سے کہا تھا کہ اسے عثمان گوٹھ تک پہنچادے ۔۔۔ پھر تھانیدار نے گدھا گاڑی والے کو پکڑ لیا۔ وہ قسمیں کھانے لگا کہ اُس عورت کو وہ عثمان گوٹھ تک صحیح وسلامت پہنچا کر آیا ہے۔ لیکن اس کے سچ پر کسی نے یقین نہیں کیا۔ تھانیدار نے اُس پر ڈنڈے برسانے شروع کردیئے۔

فرید نے کہا۔ "اگر تم اُسے میرے گھر تک پہنچاتے تو وہ گھر میں ہی ملتی۔ سچ سچ بتاؤ کہ تم اُسے کہاں لے گئے ہو؟"

گاڑی بان نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اسے آپ کے دروازے تک پہنچا کر آیا ہوں۔"

تھانیدار نے پوچھا۔ "کیا تم اُن عورتوں کو پہچان لوگے جنہوں نے شادو کو گھر میں بُلایا تھا؟"

"عورتیں ۔۔۔؟" گاڑی بان نے بوکھلا کر کہا۔ "وہاں میں نے کسی عورت کو نہیں دیکھا ہے ۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ مکان کا دروازہ بند تھا ۔۔۔ میرے واپس جانے تک وہ عورت کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹا کر کسی کو آواز نہیں دی تھی۔ میں نہیں جانتا کہ میرے جانے کے بعد وہ اس مکان میں گئی تھی یا کسی دوسری طرف چلی گئی تھی۔"

"یہ بکواس کرتا ہے تھانیدار صاحب!" فرید نے کہا۔ "شادو

دروازے تک پہنچے اور گھر کے اندر نہ جائے ــــ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ بدمعاش ہے، جھوٹ بولتا ہے۔ میرے کھیت مزدوروں نے اور گوالے نے بھی شادو کو نہیں دیکھا ہے۔ فرض کر لیا جائے کہ میری دوسری بیوی نے شادو کو سوکن سمجھ کر گھر میں گھسنے نہیں دیا تھا۔ ایسی صورت میں وہ وقتی طور پر پناہ لینے قریبی بستی میں جاتی یا آس پاس کے کسی زمیندار کے ہاں پناہ لیتی۔ لیکن تمام لوگوں کا یہی بیان ہے کہ انہوں نے شادو کو کہیں نہیں دیکھا ہے۔ یقیناً یہ بدمعاش اسے کہیں لے گیا ہے۔ نہ جانے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ نہ جانے وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔"

تھانیدار نے کہا "میں سمجھ رہا ہوں۔ یہ بدمعاش سیدھی طرح سچ نہیں بولے گا۔ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے اسے حوالات میں بند کرو۔ روز صبح و شام ڈنڈے پڑیں گے تو اس کا باپ بھی سچ بولنے پر مجبور ہو جائے گا۔۔۔۔۔۔"

گاڑی بان چیختا چلاتا، روتا پیٹتا رہا۔ مگر اس پر لات گھونسے اور ڈنڈے برستے رہے۔ جب مار کھا کھا کر اس پر نیم بے ہوشی طاری ہو گئی تو اسے حوالات میں بند کر دیا گیا ــــ جرم کسی نے کیا تھا، شامت کسی کی آئی تھی۔

واپسی پر تھانیدار نے فرید سے کہا "یہ گاڑی بان اسی طرح مار کھاتا رہے گا مگر سچ نہیں بولے گا۔ اکثر ایسے مجرموں سے ہمارا سابقہ پڑتا ہے جو عورتوں کو اغوا کرتے ہیں۔ انہیں بیچتے ہیں یا قتل کر دیتے ہیں۔ گرفتار ہونے پر اپنے جرم کا اقرار نہیں کرتے کیونکہ پھانسی یا عمر قید کی سزا ہوتی ہے۔ انکار کرتے رہنے سے زیادہ سے زیادہ دو چار روز تک مار کھانی پڑتی ہے ــــ اس گاڑی بان کے خلاف بھی کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے کہ اس نے شادو کو کہیں نہ بیچ دیا ہے یا قتل کر دیا ہے۔ قانون ہر پہلو کو ٹٹولتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے شادو کو گھر کے دروازے تک پہنچا دیا ہو۔ تمہاری دوسری بیوی نے اسے گھر میں آنے کی اجازت نہ دی ہو۔ یا شادو نے ہی سوکن کے ساتھ رہنا گوارا نہ کیا ہو۔ وہ پناہ کی تلاش میں کسی دوسری جگہ گئی ہو اور کسی دوسرے کے ہتھے چڑھ گئی ہو۔ سوچنے اور عمل کرنے کے ہزار راستے ہیں۔"

تھانیدار اس کے ساتھ گھر پہنچا تو رات ہو چکی تھی۔ اس نے کندن اور اس کی ماں کو بلا کر مختلف سوالات کئے۔ دونوں ماں بیٹی سمجھتی تھیں کہ ایسی تحقیقات سے بھی گزرنا ہوگا۔ انہوں نے پہلے ہی سوچ لیا تھا اور فیصلہ کر لیا تھا کہ چاہے جان چلی جائے مگر وہ اقرار نہیں کریں گی کہ شادو یہاں آئی تھی۔

تھانیدار مایوس ہو کر چلا گیا۔

گاڑی بان پر کھوکھلا مقدمہ چلایا جا سکتا تھا۔ مگر یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا تھا کہ شادو کو اس نے گم کیا ہے یا شادو خود کہیں چلی گئی ہے۔

کندن پر بھی شبہ نہیں تھا۔ سب یہی کہتے تھے کہ کسی نے شادو کو عثمان گوٹ میں نہیں دیکھا ہے۔ گھر کی گونگی دیواریں اس خونیں واقعہ کی گواہی نہیں دے سکتی تھیں۔ آنگن میں کھلنے والے سرخ گلاب رہ رہ کر فرید کی توجہ کو پکارتے تھے۔ فرید انہیں دیکھتا تھا، چھوتا تھا، سونگھتا تھا مگر سمجھ نہیں سکتا تھا ــــ بس دل تھا کہ ادھر کھنچا جاتا تھا۔ صبح و شام جب اسے فرصت ملتی وہ کنویں کے چبوترے پر آ کر بیٹھ جاتا۔ ایک عجیب حسرت بھری مسکراتی ہوئی آنکھوں سے ان پھولوں کو دیکھتا اور زیرِ لب بڑبڑاتا رہتا ــــ نیم دیوانگی سی تھی۔ وہ کیا بڑبڑاتا ہے؟ یہ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا ــــ کندن ادھر سے گزرتی تو یہی سمجھتی کہ وہ شادو سے باتیں کر رہا ہے۔

کیا وہ سمجھ رہا ہے کہ شادو وہاں چھپی ہوئی ہے؟

یا وہ لہو کے پھول چغلی کھا رہے ہیں۔ "میں یہاں ہوں ــــ میں یہاں ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

وہ مرنے والی ہر وقت اس مجرمہ کا دل دہلاتی رہتی تھی۔

پھر ایک رات کندن اس کی چارپائی پر آ گئی اور بولی "تم کب تک مجھ سے دور رہو گے؟"

"میں بہت پریشان ہوں کندن!"

"تم مجھے سمجھنے کی کوشش کرو فرید ــــ میں تمہاری پریشانیاں دور کر دوں گی۔ میں تمہیں اتنا پیار دوں گی، اتنا پیار دوں گی کہ تم سب کچھ بھول جاؤ گے۔"

یہ کہہ کر اس نے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ فرید نے گہری سنجیدگی سے اسے دیکھا۔ وہ بھی پیار کی اور توجہ کی مستحق تھی۔ وہ بھی بیوی ہی تھی۔ ایسی بیوی جو ایک گناہ کی سزا بھگتنے کے لئے ملی تھی۔ بعض عورتیں ایسی ہوتی ہیں جو عام حالات میں ذرا اچھی نہیں لگتیں۔ صرف گناہ کے وقت برداشت کر لی جاتی ہیں۔ مگر اب فرید کے سامنے گناہ نہیں تھا ایک خاوند کا فرض تھا۔ اس نے سر جھکا کر کہا۔

"اچھی بات ہے۔ بتی بجھا دو۔"

"کیوں ــــ؟" وہ اٹھلا کر بولی "ہم کوئی گناہ تو نہیں کر رہے ہیں۔"

"جو کہتا ہوں وہ کرو ــــ ورنہ میں سو جاؤں گا۔"

وہ چپ چاپ اٹھ گئی اور لالٹین کے پاس آ کر اسے بجھا دیا۔ کمرے میں تاریکی پھیل گئی۔ اس تاریکی میں فرید نے کندن کو گم کر دیا اور آنکھیں بند کر کے شادو کا سراپا تلاش کرنے لگا ــــ وہ آ گئی ــــ اس کے برابر لیٹ گئی۔

وہ کون ہے ــــ؟ وہ آنے والی کون ہے؟"

اُس نے ہاتھ بڑھا کر اُسے چھو لیا — تمام نازک بدن تقریباً ایک جیسے ہوتے ہیں۔ صرف ادائیں اور سپردگی کے انداز مختلف ہوتے ہیں۔ اندھیرے میں جس پیکرِ جاناں کا تصور کرو، وہی سامنے آجاتی ہے — اور وہ سامنے تھی۔ اس کے ہاتھ سنہری زلفوں سے کھیل رہے تھے۔ پھر اُس کی انگلیاں رخساروں پر آئیں تو رخسار شہابی تھے۔ اس کے ہونٹ لبوں پر اُترے تو وہ سُرخ گلاب کی پتّیوں کی طرح ملائم تھے اور جذبوں کی حدّت سے لرز رہے تھے۔

تاریکی جگمگا رہی تھی۔ سب کچھ نظر آرہا تھا۔ مگر کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ دو جسم اندھے سفر پر رواں دواں تھے۔ ریشمی پنکھڑیوں کا پیرہن کھُل رہا تھا، ذہنوں پر نشیلی دھُند چھا رہی تھی۔ ایک اپنے راستے پر بہکا کر لانا چاہتی تھی، دوسرا اپنے راستے بہکتا جا رہا تھا۔ بعض اوقات منزل ایک ہوتی ہے۔ مگر راستے الگ الگ ہوتے ہیں۔ دو بدن ایک دوسرے سے بہت قریب ہوتے ہیں۔ مگر ذہنی طور پر دُور رہتے ہیں۔ کچھ اسی انداز میں وہ بہک رہے تھے، مچل رہے تھے۔ ان کے درمیان سانسوں کی آندھیاں چل رہی تھیں۔ ٹھیک اسی وقت فرید جذبات سے مغلوب ہو کر بڑبڑانے لگا۔

"شادو — میری شادو — میں اب تم سے دُور نہیں ....!"

یک بیک کندن تڑپ کر اس سے الگ ہو گئی اور چیخ کر بولی۔ "کون شادو — ؟ کہاں کی شادو — ؟ مر گئی تمہاری شادو، تم — تم شادو سمجھ کر میرے قریب آئے ہو — میں کُتیا بننا پسند کروں گی مگر شادو بن کر تمہارے پاس نہیں آؤں گی ...."

وہ روتی ہوئی اپنی منجی پر آکر گر پڑی۔

فرید اندھیرے میں اپنا سر تھامے بیٹھا رہا اور سوچتا رہا۔ پھر اُس نے کہا۔ "میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ میں بہت پریشان ہوں۔ مجھے تم سے نفرت نہیں ہے کندن — مگر ابھی میں تمہیں محبت بھی نہیں دے سکتا۔ وہ بُری طرح میرے حواس پر چھائی ہوئی ہے۔ شاید میں اسے کبھی نہ بھلا سکوں۔ جب میں ان گلابوں کو دیکھتا ہوں تو وہ آپ ہی آپ میری نگاہوں کے سامنے روشن ہو جاتی ہے۔"

وہ چونک کر آنگن کی طرف دیکھنے لگی — وہ گلاب — وہ سُرخ گلاب یقیناً اُسے شادو کی یاد دلاتے ہیں۔ اس عورت نے ان کی سُرخی میں اپنا لہو گھول دیا ہے اور اب میری زندگی میں زہر گھول رہی ہے۔

وہ تلملاتی ہوئی، اپنی مُٹھیاں بھینچ کر منجی پر بیٹھ گئی۔ فرید اپنی منجی پر دوسری طرف منہ کئے لیٹ گیا تھا اور سونے کی کوشش کر رہا تھا۔

آہستہ آہستہ رات گزرنے لگی۔

ایک بار بچّہ اُٹھا تو کندن نے اسے تھپک تھپک کر سُلا دیا۔

پھر رات کی خاموشی میں فرید کے خرّاٹے گُونجنے لگے۔ جب اُسے یقین ہو گیا کہ وہ گہری نیند سو گیا ہے تو وہ منجی سے اُتر گئی۔ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اپنے کمرے سے نکل کر اپنی ماں کے کمرے میں آئی۔ وہاں اُس نے اپنے مرحوم باپ کا صندوق کھولا اور اس میں سے وہ خنجر نکال لیا۔ وہی خنجر — ایک بار جس کی دھار آزما چکی تھی۔

آج وہ سر قلم کرے گی — ایک ایک پھُول کا — ایک ایک شاخ اور ایک ایک پودے کا — آج کے بعد اُس آنگن میں لہو کے پھُول نہیں کھلیں گے۔ نہ پھُول کھلیں گے۔ نہ فرید انہیں دیکھے گا اور نہ ہی اُس کی یاد آیا کرے گی۔ وہ تمام پودوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے گی۔

ٹھیک ہے کہ فرید ناراض ہوگا۔ طیش میں آکر اُسے مارے گا، کوئی بات نہیں، اپنے مرد کی مار بھلی ہے مگر سوکن کے چُبھتے ہوئے کانٹے سہے نہیں جاتے۔

بس آج آخری فیصلہ ہے۔

آج پھر دو سوکنوں کے درمیان ایک فیصلہ کُن جنگ ہوگی۔

صُبح ہو رہی تھی۔ آنگن پر سایہ کرنے والے درخت کی شاخوں پر چڑیاں چہچہا رہی تھیں اور اِدھر سے اُدھر پھُدکتی ہوئی گلاب کے پودوں کی جانب دیکھ رہی تھیں۔ تمام پودے سرِ مغرور کی طرح تنے کھڑے تھے اور سُرخ گلاب ہوا کی چھیڑ خانی سے جھُوم جھُوم کر مسکرا رہے تھے۔

خبیث بڑھیا نے اپنے کمرے سے نکل کر باورچی خانے کی طرف جاتے ہوئے ان پودوں کی جانب دیکھا تو ٹھٹھک گئی — پھر اس کا کلیجہ کانپ گیا — پھر وہ حلق کے بل چیختی ہوئی کنویں کے چبوترے اور پودوں کے درمیان آئی اور اپنی بیٹی کے پاس دو زانو ہو کر اُس پر جھُک گئی۔ [illegible] زمین پر چت پڑی ہوئی تھی [illegible] کا سر کنویں کے چبوترے پر لٹکا ہوا تھا، آنکھیں پھیل گئی تھیں، مُنہ کھُل گیا تھا — اور سانس رُک گئی تھی۔ بڑھیا کی چیخیں سُن کر فرید دوڑتا ہوا آیا اور حیرانی سے اسے دیکھنے لگا۔ پہلے اُس نے نبض ٹٹولی، پھر اس کے سینے پر ہاتھ رکھا — وہ مر چکی تھی۔

اس کا لباس جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا — یقیناً دو سوکنوں کے درمیان زبردست فیصلہ کُن جنگ ہوئی تھی۔ اس کے جسم اور چہرے پر ایسی خراشیں پڑی ہوئی تھیں جیسے شادو نے اپنے ناخنوں سے پے در پے حملے کئے ہوں۔ کندن کا خنجر پھولوں کے درمیان زمین پر پڑا ہوا تھا۔

فرید شدید حیرانی سے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ پچھلی رات کس سے لڑتی رہی تھی — ؟ وہ کیسے

قتل کرنے کے لئے خنجر لیکر آئی تھی؟ اور وہ کون ہے جس نے اس کے لباس کی دھجیاں اڑا دی ہیں اور جسم اور چہرے کو لہولہان کر دیا ہے؟

ایک گھنٹہ بعد تھانیدار اپنے سپاہیوں کے ساتھ آیا تو وہ تماشہ اس کی سمجھ میں بھی نہیں آیا۔ اس نے سختی سے پوچھ گچھ کی — نہ بڑھیا اپنی بیٹی کی دشمن تھی۔ نہ ہی فرید کا اپنی بیوی سے جھگڑا تھا۔ ان دونوں پر شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ انہوں نے کندن کو ہلاک کیا ہے۔

لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے شہر بھیج دیا گیا۔

دوسرے دن شام کو رپورٹ ملی کہ حرکت قلب بند ہونے سے موت واقع ہوئی ہے۔ اس کے لباس میں دو ایک چبھے ہوئے کانٹے پائے گئے تھے۔ جن سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا تھا کہ اس کے جسم اور چہرے پر کانٹوں سے خراشیں پڑی تھیں۔ تھانیدار دوسری بار آنگن میں آیا۔ اس کے ساتھ فرید نے بھی پودوں کا قریب سے معائنہ کیا تو ایک آدھ جگہ لباس کے ادھڑے ہوئے دھاگے کانٹوں سے الجھے ہوئے نظر آئے۔ کہیں کہیں شاخیں اور پھول زمین کی طرف جھک گئے تھے۔ لیکن انہیں دیکھ کر صرف اتنا ہی معلوم ہوا کہ کندن ان کے درمیان سے گزری تھی۔ مگر ان کے درمیان سے گزرنا اور بات ہے اور دنیا سے گزر جانا اور بات ہے۔ اس حقیقت کا پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ خنجر لیکر وہاں کیوں آئی تھی؟ اور اس قدر کیسے دہشت زدہ ہو گئی کہ حرکتِ قلب ہی بند ہو گئی؟ وہ دہشت زدہ کرنے والی ہستی کون تھی؟

بہت مشکل ہے۔ بعض اوقات حقیقت تک پہنچنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ ایسے وقت ضعیف الاعتقادی پر تکیہ کیا جاتا ہے۔

رات — پچھلی رات اندھیری تھی۔

ستاروں کی روشنی بس اتنی تھی کہ آنگن میں ایک سایہ حرکت کرتا نظر آ رہا تھا۔

ایک چڑیل خنجر بکف جا رہی تھی۔ ناپ تول کر قدم رکھ رہی تھی۔ کچھ اس طرح سہمی ہوئی تھی جیسے پھر ایک بار جیتی جاگتی سوکن سے نبرد آزمائی کے لئے جا رہی ہو۔ پہلا تجربہ یاد تھا کہ سوکن نے کیسی جی داری سے مقابلہ کیا تھا۔ اس لئے انتقام کے شدید جذبے کے پیچھے خوف اور دہشت بھی چٹکیاں لے رہی تھی۔

ایسے ہی وقت جب وہ پودوں کے قریب پہنچی تو وہاں کی زمین اونچی نیچی تھی۔ ڈگمگاتے ہوئے قدم متوازن نہ رہ سکے اور وہ لڑکھڑا کر ایسے گری کہ گرنے کے دوران کتنے کانٹوں سے زخمی ہوتی ہوئی پودوں کے درمیان پہنچ گئی۔

ایک طمانچہ مارنے پر ہتھیلی زخمی ہوئی تھی۔ خنجر بکف آنے پر سارے جسم میں کانٹے چبھ رہے تھے جیسے سوکن اپنے ناخنوں سے خراشیں ڈال رہی ہو۔ اس نے کروٹ بدل کر اٹھنے کی کوشش کی تو اس کے جسم کا بوجھ ایک پودے پر پڑا۔ اس پودے کا بوجھ دوسرے پودے پر پڑا اور وہ ایکدم سے بوکھلا گئی۔ کیونکہ ایک ساتھ دو پودے اس کی گردن پر ایسے جھک گئے تھے جیسے گلا گھونٹنے آ رہے ہوں۔

ایک بڑا سا سرخ گلاب اس کی آنکھوں کے سامنے تھا اور اس میں سے شادو جھانک رہی تھی۔ سوکن کا زندہ چہرہ دیکھ کر اس نے چیخنے کی کوشش کی لیکن آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی تھی۔ نہ جانے خنجر ہاتھ سے چھوٹ کر اندھیرے میں کہاں جا پڑا تھا۔ وہ تڑپ کر کروٹ بدلتی ہوئی دوسری طرف کے پودوں پر چلی گئی۔ وہاں بھی وہی حشر ہوا۔ کپڑے پھٹ رہے تھے، نوکیلے ناخن اسے نوچ کھسوٹ رہے تھے۔ وہ ادھر سے ادھر ہو رہی تھی، الٹ پلٹ ہو رہی تھی۔ سوکن کے شکنجے سے نکلنے کی جدوجہد کر رہی تھی۔ شادو اسے جھنجھوڑ رہی تھی۔ بار بار اسے پٹخ رہی تھی۔ اس کا گلا گھونٹ رہی تھی۔ اسے تڑپا تڑپا کر مار رہی تھی۔

وہ آخری بار اٹھی تو کانٹے شلوار کی دھجیوں سے الجھ گئے، اور وہ چبوترے کے پاس گر پڑی۔ ایسے گری کہ پھر نہ اٹھ سکی۔ دہشت زدہ دل اپنی دھڑکنیں بھول گیا۔

بہت مشکل ہے — بعض اوقات حقیقت تک پہنچنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

وہ بڑھیا دروازے پر بیٹھی کنوئیں کے اس پار دیکھتی ہے۔ عبرت حاصل کرتی ہے اور بار بار ہاتھ اٹھا کر توبہ کرتی ہے۔ وقت تیزی سے گزر رہا ہے، وہ اپنی قبر کے کنارے پہنچتی جا رہی ہے۔ بیٹی مر گئی ہے وہ بھی کچھ دنوں میں فنا ہو جائے گی مگر وہ لہو کے سرخ گلاب کھلے ہیں اور کھلتے رہیں گے۔

وقت تیزی سے گزر رہا ہے۔

بچہ پانچ برس کا ہو گیا ہے۔ وہ آنگن میں کھیلتا ہے۔ کھیلتے کھیلتے اپنی ان دیکھی اور انجانی ماں کے پاس آتا ہے اور دودھ کا چٹخارہ لینے والے ہونٹوں سے اپنی ماں کو چومتا ہے اور آئندہ بھی چومتا رہے گا۔ سرخ گلاب کی محبت اسے ورثہ میں ملی ہے۔

فرید صبح کھیتوں میں جانے سے پہلے اور کھیتوں سے آنے کے بعد چبوترے پر بیٹھ جاتا ہے اور حسرت بھری نظروں سے مسکراتے ہوئے سرخ گلابوں کو دیکھتا ہے۔ اپنی محبت کو دیکھتا ہے لیکن محبت کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا۔

شادو اسی طرح آنکھ مچولی کھیلتی رہے گی۔